

آسٹریا کے نام ور ادیب اسٹیفن ژینگ کے ایک نیا داستان کا ترجمہ
ایک مسیحا کے کہنا تھا، اس نے آئینہ دیکھنا شروع کر دیا تھا
ترجمہ • ظفر اقبال

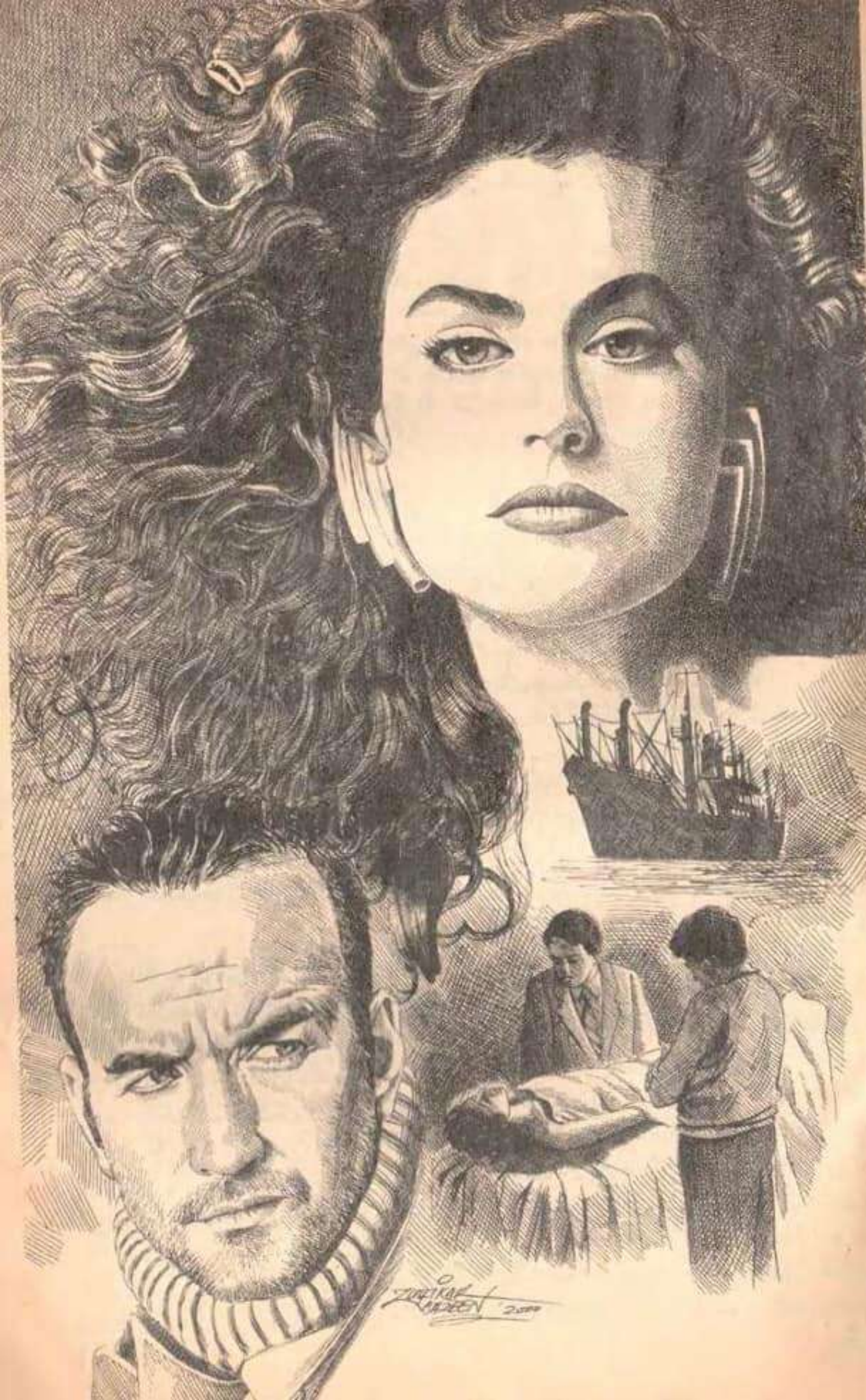
دوسرے مسافروں سے بے پروا سمندر کے نظارے میں محو رہا۔
جہاں تک مسافروں کا تعلق ہے، میں اس عرصے میں ان کے
چہروں سے اکتا گیا تھا۔ میں ان کے متعلق بہت کچھ جان چکا تھا اور
میرا دل ان کی رفاقت سے بھر گیا تھا۔ عورتوں کی مسلسل کھسر
پھسر اور رخصت پر جانے والے ولندیزی افسروں کی پھپھسی
بجائیں میرے لیے سوہان روح تھیں۔ میں نے سیلون میں جا کر
پناہ لی مگر وہاں سے کچھ دیر بعد مجھے اٹھنا پڑا کیوں کہ وہاں شنگھائی
کی کچھ انگریز لڑکیاں کھانے کا وقفہ پانچ بج کر گزر رہی تھیں،
اب میرے پاس اپنے کمرے کے سوا کوئی جگہ نہ تھی۔ دوپہر کا
کھانا کھانے کے بعد میں نوٹا تو رات کے کھانے اور اس کے بعد
کے رقص سے بچنے کے لیے کچھ بوتلیں ساتھ لے آیا اور دن کا
زیادہ حصہ بے خودی کے عالم میں گزارنے کے لیے بارہ گھنٹے
سونے کا پروگرام بنالیا۔

میں بیدار ہوا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ میرے کمرے کی ہوا
پہلے سے زیادہ مکرر ہو رہی تھی۔ میں نے پنکھا بند کر دیا لیکن ذرا
سی دیر میں پسینے سے شرابور ہو گیا۔ زیادہ دیر تک سونے کی وجہ
سے میں بھاری پن محسوس کر رہا تھا۔ یہ اندازہ کرنے کے لیے کہ
میں کہاں ہوں، مجھے اپنے حافظے پر کافی زور دینا پڑا۔ نصف سے
زیادہ رات بیت چکی تھی۔ سیلون سے گانے کی آواز آنا بند ہو گئی
تھی اور چھت پر آمدورفت کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ صرف
انجن چلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی جو بوجھ اٹھائے ہانپتا ہوا
تار کی میں آگے بڑھ رہا تھا۔

میں جہاز کی چھت کی طرف چل پڑا جو اس وقت بالکل
سناں تھی۔ رات خنک اور روح افزا تھی اور ہوا دروازے کے
جزیروں کی مہک سے معطر۔ جب سے میں جہاز میں سوار ہوا تھا،
پہلی دفعہ مجھے سونے کی خواہش ہوئی تھی۔ میں رات کی آغوش
میں لیٹ کر سمندر کا نظارہ کرنا چاہتا تھا لیکن آرام کر سیاں بند
سب بنگ

مارچ 1912ء میں نیپلز کی بندرگاہ پر وطن نامی جہاز سے
سامان اتاراجا رہا تھا تو ایک عجیب حادثہ پیش آیا۔ اس کے متعلق
اُس وقت کے اخبارات میں انتہائی بعید از حقیقت باتیں شائع
ہوئیں۔ اگرچہ میں یہ حادثہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکا کیوں کہ
میں شام گزارنے کے لیے ساحل سمندر پر چلا گیا تھا تاہم حادثہ
ہو جانے کے بعد اب میں اس حالت میں ہوں کہ اصل واقعات
بے نقاب کر سکوں۔ اس حادثے کو اب کافی عرصہ گزر چکا ہے
اور مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ میں مہر سکو نہ توڑوں جو اب
تک حادثے کے صحیح حقائق پر ثبت رہی ہے۔

میں ایک مدت سے ریاست ہائے ملایا کی سیاحت کر رہا تھا
کہ اچانک مجھے ایک ذاتی کام سے گھر لوٹنا پڑا۔ سنگاپور پہنچ کر میں
وطن نامی جہاز پر سوار ہوا۔ مجھے جو کمرہ تفویض ہوا، وہ تنگ و
تاریک ہونے کے علاوہ انجن کے کمرے سے متصل تھا۔ کمرے
کی فضا انجن کے تیل سے مکدر ہو رہی تھی۔ اسے کم کرنے کے لیے
مجھے بجلی کا پنکھا چلانا پڑا۔ نیچے انجن کی دھک دھک کی آواز اور
مسافروں کے چلنے پھرنے کا مسلسل شور تھا۔ میں نے اپنا سامان
جملیا اور فوراً چھت کی طرف چلا گیا تاکہ تازہ ہوا میں جا کر دم
لوں۔ کچھ کچھ بھرے ہوئے جہاز کا یہ وسیع بالائی حصہ لوگوں کی
بھیڑ اور گھما گھمی سے گونج رہا تھا۔ مسافر ایک دوسرے سے گفتگو
میں منہمک تھے۔ کرسیوں پر براجمان عورتوں کے ہلکے پھلکے
قبضے، لوگوں کی چمپل پھل اور عام شور و غل نے کچھ عجیب ہنگامہ
برپا کر رکھا تھا۔ میں ملایا کی سیاحت کر کے آ رہا تھا اور اس سے قبل
برما اور سیام کے علاقوں کی سیر کر چکا تھا جو میرے لیے ایک اجنبی
دنیا تھی۔ میرا ذہن نئے تاثرات سے معمور تھا۔ میں اُن کے
متعلق آسودگی اور اطمینان کے ساتھ سوچنا اور اپنے خیالات
ذہن میں مجتمع کرنا چاہتا تھا لیکن اس شور و غوغا میں سکون محال تھا۔
تین دن تک میں نے بڑے جبر اور صبر سے کام لیا اور



کہانی کار، مضمون نگار، ناقد اور ڈراما نگار اسٹیفن ڈیگ، آسٹریا کی مردم خیز سرزمین اور مصوروں، شاعروں اور موسیقاروں کے شہر ویانا میں پیدا ہوئے، تاریخ پیدائش ہے، 28 نومبر 1881ء، ویانا یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی سند حاصل کی، 24 سال کے تھے کہ پہلی عالمی جنگ چھڑ گئی اور زودرنج، انسان دوست اسٹیفن ڈیگ کو ویانا سے جانا پڑا، یورپ کے کئی شہروں میں گھومتے رہے اور ہندوستان کے دور دراز علاقوں کا سفر کرتے ہوئے آخر سوئٹزرلینڈ چلے گئے اور جنگ کے خلاف نبرد آزما قلم کاروں کی انجمن میں شامل ہو گئے۔ امن قائم نہیں رہتا تو جنگ بھی ختم ہو جاتی ہے۔ ایک روز جنگ ختم ہو گئی اور اسٹیفن ڈیگ کو اپنے وطن واپس جانے کا موقع مل گیا۔ سالزبرگ میں انہوں نے اقامت اختیار کی۔ 1934ء میں نازیوں نے انہیں ملک بدر کر دیا اور شہر شہر یاراں اور بہ قول شخصے شہر دل داراں لندن نے انہیں پناہ دی، برطانوی شہریت کے اعزاز سے نوازا، اسٹیفن ڈیگ وہیں کے ہو جاتے۔ لندن کا اپنا ایک سحر ہے مگر چند سال بعد جنگ کے بادل پھر منڈلانے لگے۔ اس بار جنگ جویوں کے پاس زیادہ ساز و سامان تھا، سو معرکہ بھی غضب کا تھا۔ دوسری عالمی جنگ میں برطانیہ بڑی طرح الجھ گیا تھا۔ لندن شہر بم باری کی زد پر تھا اور شہر کے مکین آسمان سے ڈرنے لگے تھے۔ سارا شہر زمین دوز پناہ گاہوں میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ جنگ بہت اندھی ہوتی ہے، جنہیں اُس سے کوئی واسطہ نہیں، وہ انہیں بھی معاف نہیں کرتی۔

رات کی تاریکی میں ایک اجنبی کا قرب مجھے عجیب اور پراسرار محسوس ہوئے لگا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور وہم تھا کہ اُس کی نگاہیں مجھ پہ مرکوز ہیں۔ پس منظر کی تاریکی کی وجہ سے دونوں کے چہرے ایک دوسرے کو صرف دھندلے خاکے کے مانند دکھائی دے رہے تھے۔ میں اس کی سانس اور دھیمے کش کی آواز تک سن سکتا تھا۔ خاموشی ناقابل برداشت ہو گئی تو میں اُنھ کے چلنے لگانے پر اس خیال سے رُک گیا کہ اب اس سے گفتگو کیے بغیر چلے جانا کج خلقی کے مترادف ہو گا۔ اس ذہنی کشمکش میں، میں نے سگریٹ سلگایا۔ ایک دو سیکنڈ کے لیے دیاسلائی کی روشنی ہوئی اور ہم نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا۔ ایک بالکل اجنبی صورت میرے سامنے تھی جسے میں نے اب تک نہ تو کھانے کے کمرے میں دیکھا تھا، نہ ڈیک پر۔ اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر مجرمانہ اور دیو صفت دکھائی دیا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے چہرے کے نقوش روشنی کے اس مختصر وقفے میں زیادہ ابھر آئے تھے۔ بیشتر اس کے کہ میں اس کے چہرے کے نقوش بخوبی دیکھ پاتا، روشنی بجھ گئی اور اندھیرا چھا گیا۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ پھر وہ واحد چیز جو مجھے دکھائی دے رہی تھی، وہ پائپ کی مدھم روشنی اور اُس میں کبھی کبھار چپکنے والے عینک کے شیشے تھے۔ ہم دونوں مہربان تھے۔ خاموشی استوائی علاقوں کی طرح گراں اور بوجھل ہو رہی تھی۔ آخر اسے شب بخیر کہہ کر میں واپس ہوا، اندھیرے میں، میں نے فرش پر بکھرے ہوئے لنگر سے ٹھوکر کھائی۔ وہ شخص جو رستے کی گاتھ پر میرے قریب بیٹھا تھا، ڈمگاتے قدموں سے میری طرف آ رہا تھا۔ اُس نے بوکھلا کر جلدی سے کہا۔ ”معاف فرمائیے، میں آپ کو ایک سب ٹنگ

کر کے رکھ دی گئی تھیں اور میری دست رس سے باہر تھیں۔ اس سنان مقام پر میرے سونے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ میں رستے پھلانگتا ہوا جہاز کے اگلے حصے پر جا پہنچا، وہاں لوہے کے کمرے پر سر رکھ کر دیر تک چمک دلا لہروں میں جہاز کو راستہ بناتے ہوئے دیکھتا اور لہروں کی موسیقی سے محفوظ ہوتا رہا۔ مجھے کچھ علم نہیں کہ میں وہاں کتنی دیر کھڑا رہا۔ چٹان کی طرح ایستادہ میں وقت کی حرکت سے بے نیاز تھا۔ صرف ایک چیز جس کا مجھے احساس تھا، وہ ایک طرب خیز سرور تھا۔ میں خوابوں کی وادی میں کھو جانے کا متمنی تھا لیکن یہ سحر آفریں منظر چھوڑ کر اپنے لحد نما کمرے میں جانے کے لیے بھی آمادہ نہ تھا۔ ایک دو قدم چلنے کے بعد میں نے اپنے پاؤں سے رستے کی ایک گاتھ محسوس کی اور اس پر بیٹھ گیا اور اپنے آپ کو رات کے خمار آگیاں کیف کے سپرد کر دیا۔

اپنے قریب کسی کے کھانسنے کی آواز سن کر میں چونکا۔ آنکھیں ذرا تارکی سے مانوس ہو گئیں تو میں نے قریب ہی عینک کے شیشوں کی چمک دیکھی۔ عینک سے ذرا نیچے تمباکو کا دھواں دکھائی دیا جو بظاہر پائپ میں سے اُنھ رہا تھا۔ وہاں بیٹھنے سے قبل میں سمندر اور کشتیاں کے نظارے میں محو اپنے ہم نشین سے بے خبر رہا جو اس تمام وقفے میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا ہو گا۔ اپنے گرد و پیش کا خفیف سا جائزہ لینے کے بعد میں اس جگہ اپنی آمد اس اجنبی کے لیے بے جا مداخلت تصور کرنے لگا۔ میں نے اپنی ملکی زبان جرمن میں اس سے معذرت چاہتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس بے جا مداخلت کے لیے معاف کیجیے۔“ اس کا اس نے اسی زبان اور ٹھیکہ جرمن لب و لہجے میں جواب دیا ”نہیں! کوئی بات نہیں۔“

اسٹیفن ڈیگ تو پھولوں کی شیدائی، بہاروں کے تمنائی تھے۔ انہوں نے امریکہ کا رخ کیا۔ 1940ء میں وہ امریکہ پہنچے تھے اور اگست 1941ء میں کسی گوشہ سکون کی جستجو میں برازیل چلے گئے۔ یہاں بھی ان کا جی نہیں لگا۔ 1942ء میں نازیوں کی فتوحات کی خبروں نے انہیں ایسا آزدہ و کبیدہ کیا کہ دونوں میاں بیوی نے ایک ساتھ خودکشی کر لی۔ بعد میں نازیوں کو شکست ہو گئی تھی۔ دو سال بعد جنگ سرد پڑ گئی۔ بعض مورخوں کا خیال ہے کہ برازیل جانے کے بعد ڈیگ اور ویران ہو گئے تھے۔ برازیل کی دنیا ان کے لیے بڑی اجنبی تھی۔ ادھر جنگ کی عالم گیر دہشت نے انہیں اعصابی طور پر پس پا کر دیا تھا۔ کاش وہ زندگی ترک کر دینے کا فیصلہ دو سال کے لیے مؤخر کر دیتے۔

انہوں نے بہت لکھا، انتشار اور دربدری کی زندگی میں بہت لکھا، ناول، مضامین، ڈرامے، سوانح، تنقید اور مختصر کہانیاں۔ وہ فرانڈ کی تعلیمات سے متاثر تھے۔ ان کی تحریروں میں انسانی نفسی کیفیتوں کی رنگارنگی کا بڑا خوب احوال ہے۔ کہتے ہیں، لوگ انہیں بھول گئے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ کسی نے 1981ء میں ان کی پانچ طویل کہانیوں پر مشتمل مجموعہ شائع کر دیا اور گویا اسٹیفن ڈیگ کو ایک نئی ادبی زندگی ملی۔ اس مجموعے میں سے ایک دل چسپ، اثر آفریں داستان قارئین سب رنگ کے لیے پیش ہے۔ اپنے معزز بھائی نسیم درانی، مدیر سرد بیر مجلہ سہ ماہی سیپ کے شکر نے کے ساتھ۔



مجھے جتنے کی طرف اٹھ رہے تھے۔ میں یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ وہ اجنبی آج بھی وہاں رتے کی گانٹھ پر موجود ہو گا یا نہیں۔ پھر جب میں اس جگہ کے قریب پہنچا جہاں وہ گزشتہ رات ملا تھا، مجھے ایک سرخ جلتی ہوئی آنکھ جیسی چیز دکھائی دی۔ اس کا پاپ تھا اور وہ وہاں موجود تھا۔

غیر ارادی طور پر میں وہاں رُک گیا۔ پھر میں پلٹنا ہی چاہتا تھا کہ وہ کھڑا ہو گیا اور میرے پاس آکر معذرت کرتے ہوئے مصنوعی لہجے میں کہنے لگا۔ ”مجھے یوں محسوس ہوا ہے جیسے مجھے کچھ کر آپ واپس جا رہے ہیں، کیا آپ کچھ دیر کے لیے بیٹھ نہیں سکتے؟ میری طبیعت آج بہت متحمل ہے۔“

میں نے فوراً اس کی بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ میں اس لیے لوٹ رہا تھا کہ کہیں میری آمد آپ کے لیے ناگواری کا سبب نہ ہو۔“

اُس نے کہا۔ ”نہیں، یہ بات نہیں۔ کچھ دیر کے لیے کسی کی رفاقت کا احساس میرے لیے بہت سرور کن ہے۔ کئی دنوں سے مجھے کسی سے گفتگو کا موقع نہیں ملا، معلوم ہوتا ہے گویا کئی سال کا عرصہ بیت گیا ہے۔ میں جو بات اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہوں، وہ میرے لیے ناقابل برداشت ہو گئی ہے۔ میں اب زیادہ دیر اپنے کمرے میں مقید نہیں رہ سکتا لیکن معیشت یہ ہے کہ میں مسافروں سے بھی نہیں مل سکتا۔ یہ لوگ سارا دن گپیں ہانکتے اور قہقہے لگاتے ہیں۔ اُن کی مسلسل گفتگو مجھے پاگل بنا دیتی ہے۔ وہ پاگلوں کی طرح شور مچاتے ہیں۔ ان کی آواز مجھے کمرے میں سنائی دیتی ہے جسے سن کر میں جھٹکا اٹھاتا ہوں اور اپنے کان بند کر لیتا ہوں۔ ان لوگوں کو علم تک نہیں ہوتا کہ میں

تکلیف دینا چاہتا ہوں۔“ وہ پھر ذرا جھجکا۔ ”چند ذاتی، انتہائی ذاتی وجوہ سے میں یہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ سفر کے دوران میں نے کسی سے شناسائی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ آپ شاید خود مجھ سے کسی ایسی بات کے متوقع ہوں گے۔ میں انتہائی ممنون ہوں گا، اگر آپ کسی سے اس بات کا تذکرہ نہ کریں کہ آپ نے مجھے اس جگہ دیکھا ہے۔ میں ایک بار پھر عرض کر دوں کہ کچھ انتہائی ذاتی وجوہ سے میں جہاز کی گماگمائی اور چہل پھل سے کنارہ کشی اختیار کرنے پر مجبور ہوں اور اگر آپ کسی سے یہ تذکرہ کریں گے کہ میں اتنی رات گئے جہاز کے اس حصے پر موجود تھا تو یہ بات میرے لیے تباہ کن ثابت ہوگی۔“

اجنبی سے اپنی ملاقات کا ذکر نہ کرنے کا وعدہ میں نے بہر حال پورا کیا لیکن اس کے بارے میں میرا تجسس بڑھتا گیا۔ میں نے جہاز پر سفر کرنے والوں کی فہرست صرف اس خیال سے چھان ماری کہ شاید مجھے کوئی ایسا نام مل جائے جو اس سے مناسبت رکھتا ہو۔ میں ہر مسافر کی طرف تجسس سے دیکھتا کہ شاید کسی کو اس کے بارے میں کچھ علم ہو، تمام دن میں بے چین رہا اور رات کا بے تابی سے انتظار کرتا رہا۔ میرا خیال رات کو اُسے پھر ملنے کا تھا۔ دراصل مجھے نفسیاتی معموں سے ہمیشہ بڑی دل چسپی رہی ہے۔ کسی بد اسرار آدمی سے ملاقات میں مجھے خاصا لطف ملتا ہے اور میں اس کے اسرار کی تہ، تک پہنچنے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہوں۔

یہ رات بھی گزشتہ رات کی طرح تاریک تھی۔ مطلع صاف تھا اور آسمان پر تارے جگمگا رہے تھے لیکن میری طبیعت کل رات کی طرح نڈھال نہیں تھی۔ میرے قدم خود بخود جہاز کے

ان کی باتیں سن سکتا ہوں یا وہ اس طرح مجھے پریشان کرتے ہیں۔“ وہ بولتا رہا پھر دفعۃً اُس نے اپنی گفتگو ختم کرتے ہوئے کہا ”میں جانتا ہوں کہ آپ میری باتوں سے پورے ہو رہے ہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں اتنا باتونی بن جاؤں۔“

میں نے کہا ”نہیں نہیں۔ میں آپ کی گفتگو میں دل چسپی لے رہا ہوں، آپ سگریٹ پیئیں گے؟“

اس نے سگریٹ سلگایا۔ مجھے ایک بار پھر اُس کا چہرہ دیکھنے کا موقع ملا۔ اُس کی شکل اب قدرے مانوس سی معلوم ہوئی۔ روشنی کے اس وقفے میں اُس نے مجھے غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک التجا جھلک رہی تھی اور نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن نہ معلوم کیوں، خاموش رہا۔ ہم رستے کی گانٹھ پر ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔ ہم دونوں خاموش تھے اور سگریٹ پی رہے تھے۔ میں نے اُس سے کوئی بات نہیں کی۔ آخر اُس نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ تھک گئے ہیں؟“

”بالکل نہیں۔“

اس نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہو گا کہ آپ کو ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ میں ایک ذہنی کرب میں مبتلا ہوں۔ میں اُس چار پر پینچ چکا ہوں جہاں یہ سب کچھ کسی کو بتادینا چاہتا ہوں ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ ایسا کیوں ہے، اس کی وجہ آپ میری سرگزشت سن لیں گے تو آپ کو معلوم ہوگی۔“

پھر اُس نے اپنے متعلق یوں کہنا شروع کیا۔ ”میں اپنے تعارف کراؤں، میں ایک ڈاکٹر ہوں اور ڈاکٹری کے پیشے میں بہت لمبے عرصے سے کام کرتا ہوں۔ بعض اوقات بہت بولناک ہوتے ہیں۔ آپ کوئی ایسا واقعہ زندگی اور موت کی سرحد سے تعبیر کر سکتے ہیں مگر ایسے واقعات میں فرض کی نوعیت نمایاں ہوتی ہے۔ بہت سے فرائض متضاد ہوتے ہیں۔ اگر کسی عمل سے کسی انسان کی زندگی بچ سکتی ہے تو بلاشبہ ڈاکٹر کو یہ فرض پورا کرنا چاہیے اور یہی وہ مقصد ہے جس کے لیے ڈاکٹر کو تربیت دی جاتی ہے لیکن ایسے اصول صرف اصول ہوتے ہیں۔ عملی طور پر امداد کسی حد تک کی جاسکتی ہے۔“

”رات آپ ایک اجنبی کی حیثیت سے یہاں آئے تھے اور اگرچہ آپ نے مجھے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور میرے آپ پر کوئی حقوق نہیں تھے لیکن جب میں نے آپ سے کہا کہ آپ کسی سے یہ تذکرہ نہ کریں کہ آپ نے مجھے یہاں دیکھا ہے تو آپ

خاموش رہے اور آپ نے میری امداد اپنا فرض سمجھی۔ آپ آج پھر آئے ہیں اور میں نے آپ سے التجا کی ہے کہ آپ بیٹھ کر میری باتیں سنیں اس لیے کہ خاموشی اندر ہی اندر میرا دل کھائے جا رہی ہے اور آپ اتنے مہربان ہیں کہ میری باتیں سن رہے ہیں۔ یہ سب کچھ آسان ہے اور میں نے آپ سے کسی مشکل بات کی فرمائش نہیں کی لیکن ایک لمحے کے لیے فرض کیجیے کہ میں آپ سے کہتا ہوں، آپ مجھے سمندر میں پھینک دیجیے تو کیا ہو گا؟ اگرچہ ایک طرح سے یہ میرے لیے آپ کی مدد ہوگی لیکن آپ میری امداد اپنا فرض نہیں سمجھیں گے۔ میرا خیال ہے کہ فرض کی بھی ایک حد ہے۔ یہ فرض جس کا آپ تذکرہ کر رہے ہیں، یقیناً وہاں ختم ہو جاتا ہے جہاں کسی شخص کی اپنی جان جو کھوں میں پڑ رہی ہو یا جہاں انسان کی ذمے داریاں جو عوامی اداروں کی طرف سے عائد کردہ ہیں، اثر پذیر ہوتی ہیں یا یہ کہیے کہ امداد کا یہ فرض ڈاکٹر کے معاملے میں کوئی حد نہیں رکھتا۔ کیا صرف اس وجہ سے کہ وہ ایک ڈاکٹر ہے، اُسے اپنی جان، جب بھی کوئی شخص امداد اور رحم کی درخواست لے کر اس کے پاس آئے، خطرے میں ڈال دینی چاہیے؟ آخر فرض کی بھی ایک حد ہے اور انسان اُس وقت اس حد کو پہنچ جاتا ہے جب وہ انتہائی مجبور ہو جاتا ہے۔“ وہ ایک دفعہ پھر آپ سے باہر ہو گیا۔

”مجھے اس برہمی کا افسوس ہے اور یہ اس لیے نہیں کہ میں نشے میں ہوں اگرچہ میں جب سے جہاز میں سوار ہوا ہوں، بہت زیادہ پی رہا ہوں مگر اس وقت نشے میں نہیں ہوں۔ ویسے تو میں کبھی کبھار پینے کا عادی ہوں مگر جب سے ان مشرقی علاقوں میں آیا ہوں، میری زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ ذرا تصور کیجیے کہ میں گزشتہ سات سال سے مقامی لوگوں اور جانوروں کے ساتھ رہتا ہوں، ان حالات میں کسی انسان کا شائستگی سے گفتگو کا طریقہ بھول جانا ایک قدرتی بات ہے۔ اتنی طویل مدت کے بعد جب اسے کسی ہم وطن سے گفتگو کا موقع ملتا ہے تو اس کی زبان فرط جذبات سے قابو میں نہیں رہتی۔ میں آپ سے ایک سوال کرنے والا تھا کہ کیا انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ تعاون کرے؟ خواہ وہ خود کیسے ہی حالات سے دوچار ہو، بالکل اُن فرشتوں کی طرح... معاف کیجیے، آپ تھک تو نہیں گئے؟“

”نہیں، بالکل نہیں۔“

وہ اپنے پیچھے کوئی چیز ڈھونڈ رہا تھا۔ میں نے کچھ کھنک سنی اور سمجھ گیا کہ یہ بوتلیں نکلانے کی آواز ہے۔ اس نے ان میں سے ایک گلاس میں انڈیل کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ دھسکی پیئیں گے نا؟“

اُس کا ساتھ دینے کے لیے میں نے تھوڑی تھوڑی پینی شروع کی۔ اُس نے دوسرا گلاس نہ ہونے کے سبب بوتل منہ سے لگلی۔

جہاز پر پانچ گھنٹیاں بچیں، اس کا مطلب یہ تھا کہ رات کے ڈھائی بج چکے ہیں۔

”میں آپ کے سامنے ایک مسئلہ پیش کرتا ہوں۔ فرض کیجیے، ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک ڈاکٹر تھا۔ ایک ڈاکٹر جو....“

وہ کچھ جھجکا، زکا اور پھر اُس نے کہنا شروع کیا۔ ”نہیں، اس طرح کام نہیں چلے گا، مجھے آپ کو سارا قصہ سن دینا چاہیے، اسی طرح جیسے میرے ساتھ پیش آیا، شروع سے آخر تک مکمل سرگزشت۔ ورنہ آپ اسے کبھی نہیں سمجھ پائیں گے۔ مجھے کسی قسم کی جھوٹی شرم اور رازداری سے کام نہیں لینا چاہیے۔ لوگ میرے پاس مشورے یا علاج کے لیے آتے ہیں تو مجھے سب کچھ بتا دیتے ہیں اگر وہ مجھ سے مدد کے طلب گار ہوتے ہیں تو انہیں اپنے انتہائی پوشیدہ اور ذاتی معاملات بھی مجھے بتانے پڑتے ہیں، اسی طرح آج میں آپ کے سامنے برہنہ ہو جاؤں گا جیسے میں آپ کا مریض ہوں۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ مشرق کے شیدا یوں میں سے ہیں، مجھوروں کے جھنڈ اور مندروں کے کلس کے دلدادہ ہیں اور ان علاقوں کے رومان سے محو نظر آتے ہیں جن کی آپ ایک دو مہینے سے سیاحت کر رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ استوائی علاقہ ان لوگوں کے لیے مسحور کن جاذبیت رکھتا ہے جو گاڑی، کاریا رکشا میں بیٹھ کر اس کا نظارہ کرتے ہیں۔ آج سے سات سال قبل میں یہاں آیا تھا تو میں نے بھی بالکل یہی محسوس کیا تھا۔ میں جن عزائم کے ساتھ آیا تھا، اُن سے میرا ذہن معمور تھا۔ مقامی زبان سیکھنا، مذہبی کتابیں اصل زبان میں پڑھنا، مقامی باشندوں کی نفسیات کا مطالعہ کرنا، استوائی بیماریوں کی تحقیق، سائنسی معلومات میں اضافہ اور اس پس ماندہ علاقے میں تہذیب کا علم بردار بننا میرے مقاصد میں شامل تھا۔“

”یہاں دیہات کی زندگی کسی ایسے گرم مکان میں رہنے سے مشابہ ہے جس کی دیواریں نظر نہ آنے والی ہوں۔ ہر چیز قوت سلب کرتی ہے۔ انسان خواہ کتنی ہی مقدار میں کونین کیوں نہ استعمال کرے، بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے، بخار اُس کی تمام تر صلاحیتیں ختم کر دیتا ہے اور یہاں کی آب و ہوا اسے کسل مند بنا دیتی ہے۔ یہاں کے منحوس جنگلوں اور دل دلی علاقوں میں رہ کر ایک یورپین اپنے تمام مشاغل اور تفریحات سے محروم ہو جاتا ہے۔“

ہے اور بہت جلد اپنی فکری کھوپڑی سے اور پھر گھر کی یاد آدمی کو جس قدر ستاتی ہے، اس کا اندازہ آپ کے لیے محال ہے۔ اور جب گھر واپس جانے کا وقت آتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اتنا کاہل اور سُست ہو گیا ہے کہ اپنی رخصت سے استفادے کے قابل بھی نہیں رہا۔ وہ سوچنے لگتا ہے کہ اگر وہ واپس وطن جائے بھی تو کوئی شخص اسے خوش آمدید کہنے کے لیے بے قرار نہیں ہو گا۔ سب لوگ اُسے بھلا چکے ہوں گے اور یہ سوچ کر وہ وہیں رہنے لگتا ہے۔ وہ میری زندگی کا الم ناک ترین دن تھا۔ جب میں نے استوائی علاقوں میں ملازمت کے لیے اپنے آپ کو بیچا تھا۔

وطن جانے کی رخصت کے حق سے دست بردار ہونا میرے لیے اتنا خود اختیاری معاملہ نہیں تھا جتنا میں نے ظاہر کیا ہے۔ میں نے جرمنی میں، جہاں میں پیدا ہوا تھا، طب کی تعلیم پائی اور جیسے ہی تعلیم مکمل کی، مجھے لپ زگ میں ایک اچھی ملازمت مل گئی۔ اگر آپ کو ان دنوں کے ملتی اخراجات دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے دیکھا ہو گا کہ معمولی امراض میں سے ایک مرض کے لیے میں نے ایک نیا طریقہ علاج تجویز کیا تھا جس سے ملتی حلقوں میں مل چل رچ گئی تھی اور میری نو عمری کی وجہ سے میری بڑی تعریف کی گئی تھی۔

”پھر ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس نے میری زندگی کے تمام راستے مسدود کر دیے۔ یہ واقعہ ایک ایسی عورت سے عاشقہ تھا جس سے میری شناسائی اسپتال میں ہوئی۔ وہ اسپتال میں ایک ایسے مریض کے ساتھ رہ رہی تھی جو اس کا دیوانہ تھا اور جس نے خود کشی کی ہاکام کو شش کی تھی۔ بہت جلد میں بھی اس عورت پر اتنا ہی فریفتہ ہو گیا جتنا وہ مریض تھا۔ عورت کے بردار میں ایک تکبر تھا، جو میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔ ایسی عورتیں جو تسلیم پسند بلکہ گستاخ ہوں، جو سلوک چاہیں میرے ساتھ رولر کھ سکتی ہیں لیکن اُس عورت نے تو مجھے بالکل لو تھرا دیا۔ میں نے وہ سب کچھ کیا جس کی اُس نے فرمائش کی اور آخر اس لیے مجھے کچھ رقم اسپتال کے خزانے سے چرائی پڑی، میری اس حرکت کا راز کھل گیا اور مجھے دور قم واپس کرنی پڑی۔ میرے ایک چچا نے رقم لوٹ کر دی لیکن میرے لیے لپ زگ میں ترقی کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔“

”عین اُس وقت مجھے علم ہوا کہ ولندیزی حکومت کو اپنی نوآبادیات کے لیے ڈاکٹروں کی ضرورت ہے اور وہ جرمن ڈاکٹروں کو بھی لے رہی ہے۔ تنخواہ اچھی تھی، مجھے شہ تو ہوا کہ اس بات میں کوئی فرق ہے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ استوائی علاقوں میں گرمیوں کی جلدی اتنی ہی جلدی ہوتی ہے جتنی ہمارے

ہے مگر میں اُس وقت جوان تھا اور جوانی میں انسان سمجھتا ہے کہ بخار اور موت دوسروں کے لیے ہوتی ہے، وہ خود ان سے بچ سکتا ہے۔
 ”پھر میرے لیے کوئی دوسرا چارہ کار بھی تو نہ تھا، چنانچہ میں نے رائٹ ویم کاراستہ لیا اور دس سال کی ملازمت کا معاہدہ لکھ کر دے دیا۔ نوٹوں کی ایک گڈی مجھے ملی۔ میں نے نصف رقم اپنے چچا کو بھیج دی۔ باقی رقم اور اس کے علاوہ جو کچھ میں فراہم کر سکا، میں نے شہر کی ایک لڑکی کو صرف اس وجہ سے دے دی کہ وہ اُس لڑکی سے بہت مشابہت رکھتی تھی جو میری تباہی کی ذمہ دار تھی۔ رقم کے بغیر حتاکہ اپنی گھڑی تک کے بغیر اُسگوں اور آرزوؤں سے قحی دامن، میں جہاز میں سوار ہو گیا اور یورپ سے چلا آیا۔ اس نئی زمین پر خوب صورت جنگلوں اور کھجور کے درختوں کے درمیان تنہائی اور سکون کے رنگین سپنے دیکھتے ہوئے میں سفر کرنے لگا۔

”میں تنہائی کا متلاشی تھا اور یہ خواہش جلد ہی پوری ہو گئی۔ حکومت نے مجھے سر ایبیا میں تعینات نہیں کیا جو اُن بڑے شہروں میں سے ہے جہاں سفید فام لوگ رہتے ہیں اور جہاں کلب، کالٹ، کتابیں اور اخبار وغیرہ میسر ہوتے ہیں۔ انہوں نے مجھے وہاں بھیج دیا (آپ نام کی فکر نہ کریں) جو خدا کی فراموش کردہ بستی ہے۔ وہاں سے قریب ترین شہر تک پورے ایک دن کی مسافت ہے۔ اس بستی میں میری سوسائٹی دو تین گاؤں افسروں پر مشتمل تھی۔ ان میں ایک دو نیم یورپین افسر بھی تھے علاقہ گھنے جنگلوں، کھیتوں اور ولی دلوں پر مشتمل تھا۔ شروع شروع میں تو یہ بات قابل برداشت تھی اور اس میں انوکھے پن کی جاؤ بیت اور کشش تھی۔ چنانچہ میں نے کچھ عرصے تک بڑے انہماک سے مطالعہ کیا۔ کچھ عرصے بعد وہاں کا وائس ریزیڈنٹ اس ضلع کا دورہ کر رہا تھا کہ اچانک موٹر کے ایک حادثے میں اس ہانگوں کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ کوئی دوسرا ڈاکٹر قریب وجوار میں نہیں تھا، اس کا فوری آپریشن کیا جانا ضروری تھا جو مجھے کرنا پڑا۔ اس کی صحت بہت جلد بحال ہو گئی اور مجھے خاصی رقم ملی کیوں کہ مریض بہت امیر آدمی تھا۔ اس کے بعد میں نے کچھ ٹھوس تحقیقات کام کیا۔ عہد قدیم میں استعمال ہونے والے زہر اور ہتھیاروں پر تحقیق کی اور اپنا جوش و خروش سرد ہونے سے پہلے میں نے وہ ساری تدابیر اختیار کیں جن سے میرا وقت خوش اسلوبی سے گزر سکے۔

”یہ سب کچھ اس وقت تک جاری رہا جب تک وہ قوت و توانائی باقی رہی جو یورپ سے روانہ ہوتے وقت مجھ میں تھی۔ پھر رفتہ رفتہ آب و ہوا کا اثر مجھ پر غالب آ گیا۔ اس علاقے کے سفید فام لوگوں سے مجھے کوفت ہونے لگی اور میں ان کی صحبت سے

کنارہ کشی اختیار کرنے لگا۔ اپنے افسردہ خیالات بدلانے کے لیے میں نے شراب پینی شروع کی۔ آخر وہ وقت آ پہنچا جب مجھے صرف دو سال مزید اس جگہ رہنا تھا پھر میں بخشش پا کر یورپ میں نئے سرے سے زندگی شروع کر سکتا تھا، اب میرے لیے اس کے سوا کوئی کام نہ تھا کہ میں یہ عرصہ ختم ہونے کا انتظار کروں اور اگر یہ حادثہ پیش نہ آتا تو میں شاید اب تک وہیں انتظار کر رہا ہوتا۔ اس کی آواز تاریکی میں کھو گئی۔ رات اس قدر سُکوت تھی کہ میں ایک دفعہ پھر جہاز پانی میں بڑھنے اور انجن چلنے کی آواز سن سکتا تھا۔ میں اس لمحے سگریٹ سلگا کر خوشی محسوس کرتا لیکن مجھے ڈر ہوا کہ کہیں یہ شخص میری کسی غیر متوقع حرکت یا دیاسلانی کی روشنی سے چونک نہ پڑے۔ کچھ دیر کے لیے سکوت رہا پھر گھڑیاں نے تین بجے کے عمل کا اعلان کیا۔ اس نے ذرا حرکت کی اور دھسکی کی بوتل اٹھائی، گویا وہ اپنے آپ کو تازہ دم کرنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر بعد نئے جوش و خروش سے اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ ”اب میں اپنے مکان میں مقید ہو گیا تھا۔ مجھے کسی سے کچھ واسطہ نہ تھا۔ ایک دن اچانک میرے دو نوکر دوڑتے ہوئے آئے، انہوں نے بتایا کہ ایک عورت مجھ سے ملنے کے لیے آئی ہے اور وہ سفید فام ہے۔ میں خود حیران رہ گیا۔ میں نے کوئی گاڑی یا کار رکنے کی آواز نہیں سنی تھی۔ یہ سفید فام عورت کون ہے اور ان دیرانوں میں کیا کرتی پھر رہی ہے؟

”آخر یہ عورت کون ہو سکتی ہے۔ خود سے یہی سوال کرتا ہوا میں نیچے آیا۔ اجنبی عورت ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی، اس کے پیچھے ایک چھٹی لڑکا کھڑا تھا جو بظاہر اس کا ملازم تھا۔ جیسے ہی وہ لپک کر مجھ سے ملنے کے لیے کھڑی ہوئی، میں نے دیکھا کہ اس نے چہرے پر دبیز نقاب اوڑھا ہوا ہے، اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، اس نے خود بولنا شروع کر دیا۔ ”ڈاکٹر گڈ مارٹنک!“ اس نے انگریزی میں کہا۔ ”میں ملاقات کا وقت لیے بغیر اس طرح آنے پر پشیمان ہوں۔“ اس نے نہایت عجلت میں یہ جملے کہے۔ مجھے یوں لگا گویا وہ پہلے سے ان جملوں کی مشق کر چکی ہو۔ ”میں جب اس علاقے سے گزر رہی تھی تو مجھے ایک جگہ کار کچھ دیر کے لیے روکنی پڑی۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ آپ یہاں رہتے ہیں۔“ یہ بات حیران کن تھی، اگر وہ کار میں سفر کر رہی تھی تو میرے مکان تک کار میں کیوں نہیں آئی۔ اس نے کہا۔ ”میں نے آپ کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ جب وائس ریزیڈنٹ کو حادثہ پیش آیا تو آپ نے کمال کر دیا۔ میں نے کچھ دن ہوئے، اسے چوگان کھیلتے دیکھا ہے۔ وہ اس طرح کھیل رہا تھا جیسے اُسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ آپ کا نام اس علاقے کے ہر شخص کی زبان پر ہے اور سب تک

۱۵۴۷ء کی لکل مکانی میں سکڑوں ہزاروں ہندو اپنا مسلمان چھوڑ کر، گھروں کو تالے لگا کر اس امید پر ہندوستان چلے گئے تھے کہ مسلمانوں کو ہمارے ہاں کے، کچھ عرصے میں امن بحال ہو جائے گا اور وہ اپنے گھر لوٹ آئیں گے۔ اس نقل مکانی کی وجہ سے ملکوں کے محلے اور محلے ہو گئے تھے۔ ہمارے محلے کے ایک طرف ”نیپھن پور“ تھا جہاں شاہ پور بمبور رہتے تھے۔ جس سے آگے شاہی باغ تھا۔ دوسری سمت رانی پور والے پیر سائے شاہ کا ”لوٹارا“ تھا جس کے قریب جو لاپے اور ترکان رہتے تھے اور باقی دو اطراف میں ہندوؤں کے گھر اور حویلیاں تھیں۔ ان گھروں میں صرف دو تین گھر شیخوں کے تھے۔

لکل مکانی کے بعد رات کے وقت میرے دو تین رشتے دار چوری کرنے نکلے تھے اور ہندوؤں کے گھروں کے تالے توڑ کر ان کا سامان لے آتے تھے۔ ایک بار وہ چوری کے متعلق باتیں کر رہے تھے کہ میں نے کہا: ”آپ پڑھے لکھے ہیں۔ کل کلاں کو چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے تو کیا کرو گے۔“

ان میں سے ایک نے جواب دیا کہ ”پکڑے جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ پہلی بات یہ ہے کہ رات کو چار سو دیرانی چھائی ہوتی ہے اور دوسری بات یہ کہ ہم اپنی میں پیچھا ہو اکیڑا تالے پر رکھ کر ہتھوڑے کی چوٹیں اگاتے ہیں تالا ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کی کوئی تولاں بھی نہیں ہوتی اور ہم چپکے سے سامان اٹھا کر گھر لے آتے ہیں۔“

میں نے کچھ سوچتے ہوئے ان سے کہا: ”آج رات میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔“

جب رات کو سناٹا چھا گیا تو ہم چاروں افراد نکلے۔ ہمارے محلے کے عتق میں گھسٹھرائیوں کا محلہ تھا۔ ہم اس محلے میں کسی سینٹھ کے بڑے مکان پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ بیرونی دروازے پر آہنی تالا لگا ہوا تھا جس پر میرے ایک رشتے دار نے پانی میں پیچھا ہوا تولاں لہرا کر رکھا اور ہتھوڑے کی چار پانچ چوٹیں لگائیں تو تالا ٹوٹ گیا۔ تالا توڑ کر ہم اندر گئے تو ہمیں آٹکوں کے ساتھ تین کمرے دکھائی دیے جن میں سے دو پر تالے لگے ہوئے تھے اور ایک کمرہ اندر سے بند تھا، لیکن اس کا روشن دان کھلا ہوا تھا۔ میرے رشتے دار نے یہ تالے توڑنے چاہے۔ میں نے اسے روکتے ہوئے کہا: ”میں اندر جا کر دروازہ کھول دوں۔“ پھر چھلانگ لگا کر میں نے روشن دان کی سلاخیں پکڑ لیں اور ہانڈوں کے بل پر بدن کو لو پر لے گیا اور سانپ کے مانند روشن دان میں داخل ہو کر نیچے کود گیا۔ میں نے ماچس کی تیلی لگا کر بجلی کا مٹن تلاش کیا اور بلب جلا دیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے چند دن پہلے کوئی کمرہ بند کر کے باہر گیا تھا۔ الماریوں میں کچھ کپڑے اور تولیے تر پڑے ہوئے رکھے تھے۔ قریب ہی دو تین آہنی ٹرک بند پڑے ہوئے تھے اور ان کے نزدیک فرش پر کپڑے سے بنی ہوئی ایک گزی پڑی ہوئی تھی جس کی ایک چوٹی بھی تھی اور سینے پر کپڑے سے بنی ہوئی دو چھاتیاں بھی تھیں۔ وہ بالکل برہنہ تھی۔ میں کہہ نہیں سکتا تھا کہ گزی ہندو تھی یا مسلمان۔ گزی ہاتھ میں لے کر میں اسے دیکھتا رہا اور اس کی چھوٹی سی ماسک کا قصور کرتا رہا جو کھوکھرا پور کر کے بمبئی / بھارس / کلکتہ یا کسی دوسرے شہر میں خالی ہاتھ پہنچی ہوگی۔ میرے رشتے دار میرا انتظار کرتے ہوئے تھک گئے۔ انہوں نے مجھے بہت تولاں دیں اور جب میری طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو وہ تالے پر ہتھوڑے مارنے لگے۔ وہ آج تک تالے پر ہتھوڑے مار رہے ہیں، ہتھوڑے مار رہے ہیں، ہتھوڑے مار رہے ہیں۔



شیخ ادا کی ڈانری سے ترقی: مصطفیٰ ارباب

اب تک یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی تھی۔ ”آپ چائے پینا پسند کریں گی؟“ میں نے دریافت کیا۔ ”نہیں ڈاکٹر صاحب! شکریہ۔“ میرے پاس وقت تھوڑا ہے اور یہ فلوئیر کی کتاب کتنی اچھی ہے، تو آپ فرمائیں بھی جانتے ہیں؟ جو من حقیقت بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ وائس ریزیڈنٹ نے قسم کھائی ہے کہ وہ آپ کے سوا کسی سے آپریشن نہیں کرائے گا۔ ہمارا بڑا سرجن صرف ایک کام کے لیے موزوں ہے اور وہ ہے برج کھیلنا۔ یہ بات آج ہی میرے ذہن میں آئی کہ آپ سے مشورہ کر لوں۔ اس علاقے سے گزرتے ہوئے میں نے سوچا کہ اس سے لہجھا موقع اور کب ہوگا؟ ”وہ کتابیں دیکھتی رہی“ بات دراصل یہ ہے۔ ”اس نے ایک کتاب کے صفحے پلٹے ہوئے کہا۔“ بات دراصل یہ ہے کہ میری طبیعت کچھ غراب

ہم اپنے بوڑھے سرجن اور اس کے دونوں کو خیر باد کہنے کے لیے تیار ہیں، اگر ان کی جگہ آپ لے لیں۔

”وہ مسلسل باتیں کیے جا رہی تھیں۔ اُس کا یہ رویہ مجھے پریشان کر رہا تھا۔ آخر یہ مجھے کیوں نہیں بتاتی کہ یہ کون ہے؟ یہ اپنے چہرے سے نقاب کیوں نہیں اٹھاتی؟ کیا یہ بخدا میں مبتلا ہے؟ آخر اس کی گفتگو کا چشمہ خشک ہو گیا اور میں نے اسے اوپر آنے کی دعوت دی۔ اس نے چینی لڑکے کو اشارہ کیا کہ وہ وہیں کھڑا رہے اور خود میرے آگے آگے سیر حیاں چڑھنے لگی۔

”یہ بڑی اچھی جگہ ہے۔“ اس نے میرے کمرے پر ایک اچھٹی ہوئی نگاہ ڈالی۔ ”واہ! واہ! کتنی اچھی کتابیں ہیں۔ انہیں پڑھ کر مجھے کتنی خوشی ہوگی۔“ وہ کتابوں کی طرف بڑھی اور ان کے نام پڑھنے لگی۔ جب سے اس نے مجھے سلام کیا تھا، اس وقت سے سب رنگ

ہے۔ سر میں بھاری پن، بے ہوشی کے دورے اور متلی، آج صبح کار میں، میں اچانک بے ہوش ہو گئی۔ لڑکے نے مجھے سارا دیا ورنہ شاید گر پڑتی۔ اس نے مجھے پانی پلایا جس سے میری طبیعت کچھ بحال ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ شو فر شاید گاڑی بہت تیز چلا رہا تھا۔ کیوں ڈاکٹر صاحب! آپ کا کیا خیال ہے؟“

”میں دیکھے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیا یہ دورے اکثر پڑتے ہیں؟“

”نہیں، اب تک تو ایسا نہیں تھا۔ گزشتہ کچھ ہفتوں سے زیادہ کثرت سے ہونے لگے ہیں۔ صبح کے وقت میری طبیعت زیادہ خراب ہوتی ہے۔“

وہ ایک مرتبہ پھر کتاب کے ورق پلٹنے لگی۔ میں سوچ رہا تھا، آخر یہ اتنے انوکھے انداز سے کیوں پیش آرہی ہے؟ نقاب الٹ کر میری طرف کیوں نہیں دیکھتی؟ میں نے قصد اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ اگر یہ انوکھے انداز سے پیش آسکتی ہے تو میں بھی اسی طرح کر سکتا ہوں۔ اس نے کچھ دیر بعد پھر گفتگو شروع کی۔ ”ڈاکٹر صاحب! یہ تو آپ مانتے ہی ہیں کہ یہ کوئی قابل تشویش بات نہیں، نہ ہی یہ استوائی بیماریوں میں سے ہے؟“

”مجھے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ آپ کو بخند تو نہیں ہے۔ مجھے ذرا اپنی نبض دکھائیے۔“

”میں اس کی طرف بڑھا مگر وہ ٹال گئی۔“ نہیں ڈاکٹر صاحب! مجھے یقین ہے کہ بخار بالکل نہیں ہے۔ جب سے مجھے یہ دورے شروع ہوئے ہیں، اس دن سے اپنا ٹیپر پچر دیکھ رہی ہوں اور یہ کبھی نارمل سے زیادہ نہیں ہوا، میرا ضمنہ بھی بالکل درست ہے۔“

”میں کچھ دیر کے لیے جھجکا۔ اجنبی عورت کے انوکھے رویے نے مجھے شبے میں ڈال دیا۔ ظاہر ہے کہ وہ مجھ سے کچھ کم لوٹا چاہتی تھی۔ وہ یقیناً کئی سو میل کی مسافت طے کر کے میرے ساتھ فلوئیر پر بحث کرنے نہیں آئی تھی۔ ایک دو منٹ تک اسے منتظر رکھنے کے بعد میں نے اس سے کہا۔ ”کیا آپ سے کچھ سوالات کرنے کی جسارت کر سکتا ہوں؟“

”جی ہاں، جی ہاں۔ آدمی ڈاکٹر کے پاس اسی لیے تو آتا ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا لیکن پھر میری طرف پیٹھ کر لی اور کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

”کیا آپ کے ہاں کوئی بچہ ہوا ہے؟“

”جی ہاں، ایک لڑکا۔“

”آپ حاملہ تھیں تو کیا ابتدائی مہینوں میں اس قسم کی علامات ظاہر ہوئی تھیں؟“

”جی ہاں۔“ اس کا جواب اس دفعہ تیز اور فیصلہ کن انداز

میں تھا۔

”بہتر ہے کہ آپ معائنے کے کمرے میں چلیں۔ معائنے سے ایک منٹ میں اس بات کا پتا چل جائے گا۔“

”اس نے اپنی آنکھیں میری طرف کیں۔ اس کی نگاہیں نقاب چیرتی محسوس ہوئیں۔“ ڈاکٹر اس کی ضرورت نہیں، مجھے اپنی حالت کے متعلق ذرا بھی شبہ نہیں ہے۔“

کچھ وقفہ گزر گیا۔ داستان گو نے ایک اور جام پیا اور گفتگو شروع کی۔ ”آپ خود غور کیجیے۔ وہ عورت نہ معلوم کہاں سے ادھر آنکلی تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی خبیث روح میرے کمرے میں داخل ہو گئی ہو۔ اس کے رویے سے یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سرسری گفتگو کر رہی ہو، پھر کسی تمہید کے بغیر اس نے مجھ سے ایک مطالبہ کر دیا، اس طرح محسوس ہوا جیسے کسی نے اچانک مجھے خنجر بھونک دیا ہو۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ کوئی عورت اس قسم کا مقصد لے کر میرے پاس آئی ہو۔ ایسے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں لیکن ان تمام صورتوں میں عورتوں کا رویہ عجز و انکسار کا ہوتا ہے۔ اس مصیبت میں وہ اپنی آنکھوں میں آنسو لیے میرے پاس امداد کی بھیک مانگنے آتیں۔ اب مجھے ایک ایسی عورت سے واسطہ پڑ رہا تھا جو ان سب باتوں کے بجائے مردانہ عزم کے ساتھ آئی تھی۔ میں پہلے ہی بھانپ گیا تھا کہ یہ مجھ سے زیادہ باہمت ہے اور مجھے اپنی خواہش کے مطابق ڈھال سکتی ہے۔ مجھے اس کے رویے سے یک گونہ تلخی ہی محسوس ہوئی جو اس کے خلاف بغاوت کے مترادف تھی۔ میں اس میں ایک دشمن کی سی بو محسوس کرنے لگا۔“

”میں کچھ دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے بس نقاب وہ مجھے آنکھوں سے اشارے کر رہی ہو، جیسے وہ مجھے لاکھ رہی ہو، بولنے کے لیے انکسار ہی ہو لیکن میں اس کے حکم کی تعمیل کے لیے تیار نہیں تھا لہذا جب میں نے بولنا شروع کیا تو میری گفتگو اصل موضوع سے بالکل مختلف تھی، جیسے میں غیر شعوری طور پر اس کی بے اعتنائی اور انداز گفتگو کی نقل اتار رہا تھا۔ میں نے بہانہ کیا کہ میں اس کا مطلب نہیں سمجھا۔ میرا مقصد اسے اپنا مدعا و اشکاف الفاظ میں کہنے پر مجبور کرنا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ منت سماجت کرے، جیسے دوسری عورتیں عام طور پر کرتی تھیں۔ وہ میرے پاس خود سرانہ انداز میں آئی تھی اور میں اس نخوت اور رعونت کے سامنے بے بس تھا۔“

”آخر میں نے معاملے کی سب تفصیلات ظاہر کر دیں اور اسے بتا دیا کہ یہ علامات بہت معمولی ہیں اور حمل کے ابتدائی سبب تک

https://www.facebook.com/groups/372605677178945/

لوگوں کے لیے ایک ڈاؤن لوڈنگ کی جگہ

اُن کے لیے جن کے سینے دھواں دیتے ہیں،
آنسوؤں، آہوں، اُمتگوں اور حوصلوں کی داستان
عجرت اثر، حیرت انگیز و ناقابل فراموش
پاور زمان خان کی آپ بیتی، جگ بیتی
اُس جوان رعنا سے زندگی کا رویہ مختلف تھا
دل فگاروں کے لیے
سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ

بازیگر

وہ تحریر جو دلوں کی دھڑکن ہے

کتابی شکل میں چار حصے شائع ہو چکے ہیں

قیمت فی حصہ -/50 روپے، ہر ڈاک خرچ فی حصہ -/16 روپے
چار حصے ایک ساتھ منگنے پر ڈاک خرچ معاف
یہ رعایت حاصل کرنے کے لیے رقم بذریعہ منی آرڈر پیشگی روانہ فرمائیے
اس دل چسپ داستان کا پانچواں اور چھٹا حصہ

جلد شائع ہو رہا ہے

کتابیات پبلی کیشنز

رمضان چیمبرز، بلواریا سٹریٹ، آئی آئی چندری گروڈ،
پوسٹ بکس 23، کراچی 74200

دونوں میں اس قسم کے ورد ہونا ایک عام بات ہے اور کسی بد شکونی
کے بجائے یہ اس بات کا پیش خیمہ بھی ہے کہ حالات آئندہ
اطمینان بخش رہیں گے۔ میں مسلسل بولتا رہا اور اس انتظار میں رہا
کہ وہ مجھے کہیں ٹوکے۔ اس نے ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا، مجھے یوں
محسوس ہوا جیسے اس نے میرے تسلی کے الفاظ فضا میں منتشر
کر دیے ہوں۔ وہ اپنے ہاتھ کی انگلیاں میز کے ساتھ رگڑ رہی
تھی۔ وہ اپنا اضمحلال فرو نہ کر سکی۔ دفعۃً اُس نے کہا۔ ”ڈاکٹر! کیا
آپ جانتے ہیں کہ میں آپ سے کیا چاہتی ہوں؟“

”میرا خیال ہے، میں نے جو اندازہ کیا ہے، وہ صحیح ہے۔
ہمیں واضح گفتگو کرنی چاہیے۔ آپ اپنی موجودہ کیفیت ختم کرنے
کی خواہش مند ہیں اور وہ چیز ختم کرنا چاہتی ہیں جو بے ہوشی کے
دورے، تسلی اور دیگر تکالیف کا اصل سبب ہے۔ آپ یہی چاہتی
ہیں نا؟“

”جی ہاں!“ اُس کے الفاظ فیصلہ کن تھے۔
”کیا آپ کو علم ہے کہ ایسی باتیں دونوں متعلقہ آدمیوں
کے لیے کتنی خطرناک ہوتی ہیں؟“

”جی ہاں۔“
”اور کیا آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ یہ آپریشن غیر قانونی ہے؟“
”جانتی ہوں مگر بعض حالات میں یہ نہ صرف جائز بلکہ
ضروری خیال کیا جاتا ہے۔“

”جی ہاں، جب ایسا کرنے کے لیے مناسب طبی وجوہ ہوں۔“
”آپ اس قسم کی وجوہ ڈھونڈ سکتے ہیں، آپ ڈاکٹر ہیں۔“
اس نے کسی تذبذب کے بغیر میری طرف دیکھا۔ اس کا
لہجہ تحکمناہ تھا۔ میں اس کے عزم پر ششدر رہ گیا لیکن میں نے
کچھ مداخلت کی۔ میں یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے
مقابلے میں بہت باہمت ہے۔ اتنی جلدی نہیں، میں نے اپنے
آپ سے کہا۔ ”ایک ڈاکٹر ہر وقت مناسب طبی وجوہ نہیں ڈھونڈ
سکتا۔ ہاں، میں اپنے کسی ہم پیشہ ڈاکٹر سے مشورہ کرنے میں ہنگام
محسوس نہیں کروں گا۔“

”میں آپ کے ہم پیشہ لوگوں میں سے کسی سے نہیں بلکہ
آپ سے مشورہ کرنے یہاں آئی ہوں۔“
”میاں میں یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ اس خدمت
کے لیے مجھے منتخب کرنے کی وجہ کیا ہے؟“

اُس نے بہت روکھے پن سے کہا۔ ”میں آپ کو اس کی وجہ
بتانے میں کوئی قیادت نہیں سمجھتی۔ آپ ایک الگ تھلگ جگہ
رہتے ہیں۔ آپ اس سے پہلے مجھ سے کبھی نہیں ملے۔ آپ
مسئلہ اہلیت کے مالک ہیں اور کیوں کہ....“ وہ پہلی دفعہ کچھ دیر

<https://www.facebook.com/groups/372605677178945/>

کے لیے رُکے۔ ”کیوں کہ آپ زیادہ عرصے جاوا میں نہیں ٹھہریں گے، خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ آپ کے پاس گھر جانے کے لیے کافی سرمایہ موجود ہوگا۔“

”مجھے کچھ سی محسوس ہوئی۔ اس کے اس تاجرانہ حساب کتاب نے مجھے دنگ کر دیا۔ اُس کی آنکھوں میں کوئی آنسو نہیں تھا، اس کے ہونٹوں پر کوئی التجا نہیں تھی۔ اس نے میرا اندازہ کر لیا تھا۔ وہ نہ صرف میری قیمت لگا چکی تھی بلکہ اس نے میرا انتخاب پورے دثوق کے ساتھ کیا تھا۔ وہ مجھے اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا چاہتی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ میں بالکل مغلوب ہو چکا تھا۔ میں نے کہا۔ ”مگر کیوں؟“

”آپ کی اس اعانت کے لیے۔ اس کے بعد آپ کو اس علاقے کو خیر باد کہنا ہوگا۔“

”کیا آپ کو معلوم ہے کہ ایسا کرنے سے مجھے اپنی حیثیت سے ہاتھ دھوئے پڑیں گے؟“

”جو کچھ میں آپ کو پیش کروں گی، وہ اس خسارے سے بہت زیادہ ہوگا۔“

”یہ آپ کی مہربانی ہے کہ آپ اتنے واضح الفاظ میں مجھ سے معاملہ طے کر رہی ہیں لیکن میں آپ کو اس سے زیادہ واضح دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ کس قدر رقم دینے کے لیے تیار ہیں؟“

”ایک لاکھ گلڈن کا ڈرافٹ جو انیس سو ڈیم کا ہوگا۔“

”میں غصے اور حیرت سے کانپ گیا۔ یہ کثیر رقم وہ مجھے اس شرط پر دینے کے لیے تیار تھی کہ میں ولندیزی حکومت سے اپنا معاہدہ ختم کر دوں۔ اس کاروبار بہت اہانت آمیز تھا۔ میرا جی چاہا کہ اس کے منہ پر تھپڑ دے ماردوں لیکن اس کے مغرور اور غیر جذباتی چہرے کی ایک جھلک نے، اس کی ہمدرد عونت نظروں نے میرا وحشی نفس جگا دیا اور میں یک لخت حیوانی ہوس کی آگ میں جلنے لگا۔ اُس کی بھنویں یوں تن گئیں جیسے کسی امیر کی بھنویں ایک بھکاری کی بار بار التجا سے تن جائیں۔ اُس لمحے ہم نے ایک دوسرے سے نفرت کی اور ہم دونوں کو ایک دوسرے سے نفرت کا احساس بھی ہوا۔ وہ مجھ سے اس لیے متنفر تھی کہ مجھ سے کام لینا چاہتی تھی اور میں اس سے اس لیے نفرت کر رہا تھا کہ وہ مجھ سے مدد کی التجا کرنے کے بجائے حکم دے رہی تھی۔ خاموشی کے اس وقفے میں ہم نگاہوں کی زبان سے ایک دوسرے سے گفتگو کرتے رہے پھر یکایک جیسے مجھے زہریلے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ ایک خوف ناک خیال میرے ذہن کے افق پر طلوع ہوا۔ اس کی نحوست نے مجھے ہمت دلائی۔ اس کے سلوک نے مجھ میں وہ وحشی اور وہ شیطان جگا دیا جو ہم سب میں مستور ہے۔ مجھے اس

بات کا غصہ تھا کہ یہ میرے پاس ایک معزز اور مہذب خاتون کی وجاہت سے آئی ہے حالاں کہ کوئی عورت چوگان کھیل کر یا اس قسم کی کسی دوسری تفریح سے توجاہ ملے ہوئے سے رہی۔ میں نے سوچا کہ یہ مغرور عورت، جو اتنی غیر جذباتی ہو رہی ہے جس کے لیے میں محض ایک ہتھیار ہوں اور جس کے نزدیک ایک پیشہ ورانہ اہلیت سے ہٹ کر میری وقعت خاک پا کے برابر بھی نہیں، یہ اُس وقت کس قدر جذباتی ہوگی جب دو تین مہینے قبل وہ اس بچے کے باپ سے ہم آغوش ہوئی ہوگی اور آج چہ تلف کرنے پر تلی ہوئی ہے میں انہی خیالات میں محو تھا۔ اس کاروبار نے امرانہ تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ میں اس کے نامعلوم عاشق کی طرح اپنی مردانہ چابک دستی، فرط شوق اور شیفٹنگی سے اسے اپنا بنا لوں گا۔ اس سے پہلے میں نے بھی اپنی طبی حیثیت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی اور اگر اب ایسی کوشش کر رہا تھا تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ایک درندہ کسی کو اپنی جلی ہوس کا شکار بنانے کے لیے بے تاب تھا۔ یقین کیجیے کہ ایسی صورت ہرگز نہیں تھی۔ میں اُس کی رعونت زیر کرنے اور ایک قوی مرد کی حیثیت سے اُس پر اپنی فوقیت ثابت کر کے اپنی خود پسندی کی تسکین کرنا چاہتا تھا۔

”میں ایک عرصے سے راہبوں کی سی زندگی گزار رہا تھا۔ آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس عورت کو دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوئی ہوگی جو اس قدر ہمدرد عونت، سنجیدہ، آتشیں اور کم آمیز تھی۔ وہ پراسرار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے رومانی جذبات کا ثمر اٹھائے ہوئے تھی۔ ایک ایسی عورت ان حالات میں اس طرح مجھ جیسے آدمی کے دام میں مڈر چلی آئے، ایک ایسے شخص کے پاس جو درندہ صفت، اکیلا، بھوکا اور فطری رفاقت سے محروم تھا۔ میں یہ سب کچھ آپ کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ بعد کے واقعات اچھی طرح سمجھ سکیں۔ چنانچہ میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ کام میں ایک لاکھ گلڈن میں نہیں کر سکتا۔“

”تو آپ کس قدر رقم طلب کرتے ہیں؟“

”ہمیں ایک دوسرے سے بے تکلف ہونا چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”میں کوئی بیوپاری نہیں ہوں۔ آپ کو مجھے دیبا قلاش نیم حکیم نہیں سمجھنا چاہیے جو رومیو جولیٹ میں زہر کے بجائے دولت کو مملکت تر زہر کے طور پر تجویز کرتا ہے۔ اگر آپ مجھ سے کلردباری آدمی کی طرح سلوک کریں گی تو۔۔۔“

”تو آپ یہ نہیں کریں گے؟“

”کم از کم اس رقم کے لیے نہیں۔“ ایک لمحے کے لیے

<https://www.facebook.com/groups/372605677178945/>

گے۔ ”وہ بجلی کی سی سرعت سے باہر نکل گئی۔

”وہ دروازے سے نکل کے غائب ہو گئی۔ میں جہاں کھڑا تھا، وہیں جم کر رہ گیا۔ گویا اس کے منع کرنے سے میں مسحور ہو گیا تھا۔ میں نے میٹر ہیوں سے نیچے اس کے جانے کی آہٹ اور گھر کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ میں نے سب کچھ سنا۔ میں اس کا تعاقب کرنے کے لیے بے قرار تھا۔ کیوں؟ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ میں ایسا کیوں کرنا چاہتا ہوں۔ اسے واپس بلانے کے لیے، اُسے زرد کو ب کرنے کے لیے یا موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے؟ مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔ بہر صورت میں اس کا تعاقب کرنا چاہتا تھا لیکن کر نہیں سکتا تھا۔

”میری یہ حالت چند منٹ رہی پھر جیسے ہی میں نے پہلی حرکت کی، یہ ظلم ٹوٹ گیا۔ میں تیزی سے نیچے میٹر ہیوں کی طرف بھاگا۔ ایک ہی سڑک تھی جہاں سے وہ جاسکتی تھی اور وہ سڑک بستی سے گزر کر شہر کو جاتی تھی۔ میں سائیکل لینے کے لیے بھاگا لیکن جہاں سائیکل رکھی تھی وہاں جا کر یاد آیا کہ میں یہاں کی چابی اٹھانا بھول گیا ہوں، واپس جا کر چابی اٹھانے کے بجائے میں نے اس کمرے کا بانسی دروازہ دہلیز سے اکھاڑ پھینکا اور سائیکل اٹھا کر چل پڑا۔ دوسرے ہی لمحے میں پاگلوں کی طرح سائیکل پر اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اُسے ضرور پکڑنا چاہیے، اُسے کار تک پہنچنے سے پہلے جالینا چاہیے۔ مجھے ضرور اُس سے بات کرنی چاہیے۔

”پہلی سڑک میرے سامنے پھیل گئی۔ بہت راستہ طے کرنا پڑا۔ آخر وہ نظر آئی گئی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی اور چینی لڑکا اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ میں نے جیسے ہی اُسے دیکھا، اسے میرے تعاقب کا پتا چل گیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے لڑکے سے گفتگو کے لیے رُکی پھر اکیلی چل پڑی۔ چینی لڑکا وہیں کھڑا ہو گیا۔ وہ اکیلی کیوں گئی؟ کیا وہ کسی ایسی جگہ ٹھہرا کر مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے جہاں کوئی دوسرا ہماری بات نہ سن سکے؟ میں

مکمل سکوت طاری رہا، کمرے میں اس قدر خاموشی تھی کہ میں اس کی سانس تک سن سکتا تھا۔

”تو پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی منت سماجت کروں؟“

”میں نے کہا۔“ آپ کی گفتگو سے ظاہر ہے کہ آپ اسقاطِ حمل کا جواز مجھے صرف اُس وقت بتائیں گی جب میں اس کی ہاں بھریوں گا لیکن پہلے آپ مجھے جواز بتائیے پھر میں آپ کو جواب دے سکتا ہوں۔“

”اس نے اپنا سر باغیانہ انداز میں ہلایا اور کہا۔“ آپ سے استدعا کرنے کے بجائے میں مر جانا پسند کروں گی۔“

”میں برہم ہو گیا۔“ اگر آپ ایسا نہیں کریں گی تو میں آپ کو اس کے لیے مجبور کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ اب الفاظ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ آپ پہلے ہی جانتی ہیں کہ میں کیا قیمت چاہتا ہوں۔ آپ میرا سوال پورا کر دیجیے، میں آپ کی لہو کروں گا۔“

”ایک لمحے کے لیے اس کی نظریں مجھ پر جم کر رہ گئیں۔ کاش میں آپ کو اس ایک لمحے کی حالت کا احساس دلا سکتا۔ پھر

اس کے چہرے کا اضمحلال دور ہو گیا۔ اس نے ایک خوف ناک قہقہہ لگایا، ایک حقارت آمیز قہقہہ جس نے مجھے بھسم کر ڈالا۔ مجھ پر دیوانگی سی طاری ہو گئی۔ یہ نفرت آمیز قہقہہ ایک ناقابلِ یقین دھماکے کی طرح تھا اور مجھ پر اس کا اثر ایسا ہوا کہ میں اپنے آپ کو اس کے سامنے ختم کر دینا چاہتا تھا۔ میں اس کے پاؤں چومنے کا

مشتاق تھا۔ اُس کے طنز کی شدت نے مجھ پر بجلی کا سا اثر کیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ مڑی اور دروازے کی جانب چل پڑی۔

”نادانستہ طور پر میں نے اس کا تعاقب کیا کہ کسی بہانے اس سے معذرت کر لوں۔ میری روح کھلی جا چکی تھی لیکن جانے سے قبل وہ ایک لمحے کے لیے رُکی اور مجھے اس نے حکم دیا۔“

”میرے تعاقب کی کوشش نہ کیجیے گا، نہ ہی یہ پتا لگانے کی تکلیف کیجیے گا کہ میں کون ہوں۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو پشیمان ہوں۔“

”میرے تعاقب کی کوشش نہ کیجیے گا، نہ ہی یہ پتا لگانے کی تکلیف کیجیے گا کہ میں کون ہوں۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو پشیمان ہوں۔“

کو کب نورانی لوکاروی کی مذہبی تصانیف

✽ والدین رسالت مآب

✽ مسئلہ امامت

✽ اذان اور دُرود شریف

✽ مزارات و تہذیب اور ان کے فضائل

✽ اسلام کی پہلی عید (عید میلاد النبی)

✽ دیوبند سے بریلی (حقائق)

✽ ختم شریف حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ

✽ قبر کے احکام و آداب

✽ سفید و سیاہ

✽ بیادِ شیخ الاسلام

✽ اور لو مشائخ (و طائف اور دعاؤں کا مجموعہ)

✽ حقائق (غیر مقلدین کے جواب میں)

✽ اور سیکڑوں موضوعات پر آڈیو ڈیو کیسٹس

✽ خطیب پاکستان (اپنے معاصرین کی نظر میں)

✽ ہجرتی سرکار کربلا والے

منشی کاچا: مکتبہ گل زار حبیب، پاکستان لوکاروی (سولجر بازار) کراچی۔ فون 7218925۔ فیکس 7218925۔ فون 2212011

بہت تیز بھاگ رہا تھا۔ جیسے ہی میں لڑکے کے قریب پہنچا، وہ میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میں اس سے بچنے کے لیے ایک طرف مڑا مگر گر پڑا۔

”ایک لمحے بعد لڑکے کو گالیاں دیتا ہوا میں پھر اپنے پاؤں پر تھا میں نے اپنا ہاتھ مکا مارنے کے لیے اٹھایا لیکن وہ بچ گیا۔ میں نے سائیکل اٹھائی پھر سوار ہونے ہی کو تھا کہ لڑکے نے سائیکل کا ہینڈل دبوچ کر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھ سے کہا۔ ”صاحب! آپ یہاں رک جائیے۔“ میرا جواب یہی ہو سکتا تھا کہ اُسے تھوڑا مار کر بٹا دیتا۔ میں نے یہی کیا۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا لیکن سائیکل پر اپنی گرفت اس نے مضبوط رکھی۔ اس کی ترچھی آنکھیں خوف و ہراس سے لبریز تھیں، اس کے باوجود اس نے مجھے جانے نہیں دیا۔ ”صاحب! ٹھیکر جائیے۔“ اس نے پھر کہا۔

”کتے کہیں کے۔ ہٹ جا رہے۔“ میں نے گرج کر کہا۔ ”اس نے میری طرف دیکھا۔ وہ انتہائی ہراساں ہونے کے باوجود میرے حکم کی تعمیل پر آمادہ نہیں ہوا۔ غصے کی شدت سے میں نے اس کی ٹھوڑی پر ایک مکا مارا۔ وہ سڑک پر گر پڑا۔ سائیکل اس کی گرفت سے آزاد ہو چکی تھی لیکن جب میں اس پر سوار ہونے لگا تو معلوم ہوا کہ اس کا اٹلا پتیا ٹیڑھا ہو گیا ہے، مڑ نہیں سکتا۔ پتیا سیدھا کرنے کی ایک ناکام کوشش کے بعد میں نے سائیکل ایک طرف پھینک دی اور گاؤں کی جانب دوڑا۔

”میں جمہورپیروں کے آگے ایک پاگل کی طرح دوڑ رہا تھا۔ مقامی باشندے اپنے علاقے کے ڈاکٹر کو اس حال میں دیکھ کر حیران تھے۔ ایک سفید فام حاکم ایک رکشا قلی کی طرح بھاگ رہا تھا۔ میں بہتی تک پہنچا تو پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔ میں نے بیچ کر پوچھا۔ ”کار کہاں ہے؟“ ”جواب ملا۔ ”صاحب! ابھی گئی ہے۔“

”وہ لوگ حیرت سے میرا منہ تک رہے تھے۔ پسینے میں شرابور اور دھول سے لٹا ہوا میں ایک دیوانہ لگ رہا تھا۔ میں نے دور ہی سے کار کے بارے میں سوال کیا اور سڑک کی جانب نظر ڈالی تو کار کے بجائے اُس کے پیچھے اڑتی ہوئی دھول دکھائی دی۔

”لیکن خیر، اس فرار سے اُسے چنداں فائدہ نہ ہوا۔ وہ میرے پاس آئی تھی تو اس کا ڈرائیور علاقے کے لوگوں کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ چند لمحوں میں مجھے سب کچھ پتا چل گیا۔ مجھے اس کا نام معلوم ہو گیا۔ وہ دارالحکومت میں رہتی تھی جو وہاں سے ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر تھا۔ جیسا کہ میں پہلے سمجھ چکا تھا، وہ انگریز نژاد تھی۔ اس کا خاندان ایک مال دار ولندیزی تاجر تھا جو گزشتہ پانچ مہینے سے کاروبار کے لیے امریکہ گیا ہوا تھا اور چند

دنوں میں واپس آنے والا تھا۔ اس کی واپسی پر دونوں میاں بیوی انگلستان جا رہے تھے۔ اُس کا حمل تین ماہ سے زیادہ کا نہ تھا۔

”اب تک جو کچھ میں نے آپ کو بتایا ہے، یہ بتانا آسان تھا کیوں کہ یہاں تک میرے مقاصد واضح صورت میں میرے سامنے تھے۔ ایک ڈاکٹر اور مشاہدہ کرنے والے کی حیثیت سے میں آسانی سے اپنی کیفیت کی تشخیص کر سکتا تھا۔ میں بالکل بے بس سا ہو گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے افعال کس قدر احمقانہ ہیں پھر بھی اُن سے اپنے آپ کو باز نہ رکھ سکا۔ کیا آپ نے کبھی باؤلے پن کے متعلق سنا ہے؟ یہ ایک ایسی حالت ہوتی ہے جس میں انسان ایک باؤلے کتے کی سی حرکات کرتا ہے۔ یہی کچھ میری حالت تھی۔ میں نے ایک باؤلے کی طرح دائیں بائیں کچھ دیکھے بغیر انگریز عورت کا تعاقب شروع کر دیا۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ تعاقب کے لیے رول نہ ہونے سے قبل میں نے کیا کچھ کیا۔ اس کے نام اور مکان کا پتا چلنے کے ایک یا دو منٹ بعد میں سائیکل لے کر اپنے کو اتر کی طرف دوڑ پڑا۔ میں نے ایک دو سوٹ اپنے بکس میں رکھے، کچھ رقم جیب میں ڈالی اور قریب ترین ریلوے اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ میں نے اپنے افسر کو اپنی روانگی کی اطلاع تک نہیں دی اور نہ اپنے جانشین کا انتظام کیا۔ میرے نوکر میری روانگی کی خبر پا کر ہدایات کے لیے جمع ہو گئے۔ میں ان کی طرف توجہ کیے بغیر مکان اُسی حالت میں چھوڑ کر چل پڑا۔ اُس عورت کی آمد کے ایک گھنٹے بعد میں اپنے ماضی سے قطع تعلق کر چکا تھا اور کسی پاگل کی طرح بھاگتا تھا۔“

”میں ریلوے اسٹیشن پہنچا تو شام ہونے کو تھی۔ جاوا کے مہڈوں میں اندھیرا ہو جانے کے بعد حادثوں کے ڈر سے گاڑیاں چلنی بند ہو جاتی ہیں۔ ڈاک بنگلے میں ایک بے خواب رات گزارنے اور پھر ایک دن مسلسل گاڑی میں سفر کرنے کے بعد میں شام چھ بجے اُس جگہ پہنچا جہاں وہ رہتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کار پر بہت پہلے آچکی ہوگی۔ وہاں پہنچنے کے دس منٹ بعد میں اس کے دروازے پر تھا۔

میں نے اپنا کارڈ بھیجا، نوکر نے لوٹ کر بتایا کہ مالکہ کی طبیعت ٹھیک نہیں اس لیے وہ ملاقات نہیں کر سکتیں۔ اس موہوم امید پر کہ شاید وہ پچھتائے اور بڑا بھیجے، میں ایک گھنٹے تک بلکہ اس سے زیادہ دیر تک اس کے مکان کے گرد گھومتا رہا۔ پھر میں نے قریب ہی ایک ہوٹل میں کمر اکرائے پر لیا اور شراب کی کچھ بوتلیں منگوالیں۔ شراب کی بوتلوں اور خواب آور دوا کی ایک خوراک سے میں نے اپنے آپ کو مدھوش کر لیا۔ زندگی سے موت تک کی اس دوڑ میں صرف گہری نیند کا ایک وقفہ تھا۔

☆ آٹھ گھنٹیاں بچیں، اس کا مطلب تھا کہ صبح کے چار بج چکے ہیں۔ گھنٹیوں کی آواز نے داستان گو کو چونکا دیا، اس نے یکایک گفتگو ختم کر دی۔

تھوڑی دیر بعد خیالات مجتمع کر کے اُس نے اپنی کہانی پھر شروع کی۔

”اس کے بعد کا بیان میرے لیے بہت مشکل ہے۔ میرا خیال ہے، مجھے بخار ہو گیا تھا۔ بہر صورت مجھے پرچہ چڑے پن کی کیفیت طاری ہو گئی جو دیوانگی کے لگ بھگ تھی۔ میں پاگل ہو رہا تھا۔ منگل کے روز میں وہاں پہنچا تھا اور میری اطلاع کے مطابق اُس کے خاوند کو سچر کے دن آنا تھا۔ ابھی تین دن باقی تھے۔ میں اس دوران میں اسے اس مصیبت سے نجات دلا سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہیے لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ مجھ سے ملاقات ہی نہیں کر رہی تھی۔ اس کی مدد کی خواہش اور اس سے بڑھ کر اپنے ناروا سلوک کے لیے معذرت کی تمنا میرا ذہن کرب شدید تر کر رہی تھی۔ ایک ایک بل قیمتی تھا۔ اس کی امداد کرنے کے لیے میں کسی بھی جرم کے لیے تیار تھا لیکن وہ اُس سے مس نہ ہوئی۔

”اگلے دن صبح میں وہاں پہنچا تو چینی لڑکا کھڑا ہوا نظر آیا۔ اُس نے جیسے ہی مجھے دیکھا، وہ بھاگ کر اندر چلا گیا لیکن اس مختصر وقفے میں بھی میں نے اس کے چہرے کی خراشیں دیکھ لیں۔ شاید اُس نے میری آمد کی اطلاع کے لیے اتنی عجلت کی تھی اور یہ ایک ایسی بات ہے جو مجھے اب پاگل کیے دیتی ہے۔ ممکن ہے اُسے اس بات کا احساس ہو گیا ہو کہ میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں اور وہ مجھے بلانے پر آمادہ ہو لیکن اس کی صورت نے مجھے اپنے شرم ناک رویے کی یاد دلائی اور میں دروازے سے لوٹ آیا۔ میں اس وقت ایک کرب میں مبتلا تھا۔ وہ بھی اس وقت کچھ کم دکھ میں نہیں تھی اور میرا انتظار کر رہی تھی۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں ایک اجنبی شہر میں ایسے پریشان کن لمحات کس طرح بسر کروں۔ دفعۃً خیال آیا کہ مجھے ریزیڈنٹ سے ملنا چاہیے جس کی ٹانگ کا میں نے آپریشن کیا تھا۔ میں گیا، وہ گھر پر تھا۔ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اپنے تباہی کے لیے آیا ہوں۔ میرے لیے اب مزید جنگوں میں رہنا مشکل ہے۔ میں فوراً یہاں، صوبے کے دارالحکومت میں آنا چاہتا ہوں۔

”اس نے ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے ایک ڈاکٹر اپنے مریض کو دیکھتا ہے۔ ”ڈاکٹر صاحب!“ اس نے کہا۔ ”تباہی کے لیے آپ کو کچھ انتظار کرنا ہوگا۔ زیادہ نہیں، صرف تین چار ہفتے۔“

سب ٹنگ

وزیر بات تیر
عطا الحق قاسمی

اُن پڑھ دذیروں کے اپنے کچھ مسائل ہوتے ہیں جنہیں حل کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ ماضی میں ایک ایسے ہی وزیر کو یہ پر اہم پیش آئی کہ انگریزی فاطمیں وہ پڑھیں کیسے؟ اُن کے دوست نے بتایا کہ یہ فاطمیں پڑھنے کی ضرورت نہیں ہوتی، بس ان پر Seen لکھ کر نیچے دست خط کر دیے جاتے ہیں۔ جب یہ فاطمیں گھوم پھر کر واپس نیکشن آفسر تک پہنچیں تو اس نے دیکھا کہ وزیر صاحب نے ان پر اردو میں ”س“ لکھا ہوا تھا اور نیچے دست خط کیے ہوئے تھے۔

ایک اور وزیر صاحب کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے لیکن رلوی اس کا ایک حاسد ہے، لہذا اس میں مبالغہ کی گنجائش ہے۔ بہر حال راوی کے مطابق، وزیر موصوف نے ایک پیٹرول پمپ کا افتتاح کیا۔ تقریریں ہوئیں، تالیاں بچیں اور بعد میں چائے پی گئی۔ چائے کے دوران وزیر صاحب پیٹرول پمپ کے مالک کو ایک طرف لے گئے اور رازداری سے پوچھا۔ ”یاد ایک بات تو بتاؤ!“ اس نے کہا۔ ”پوچھیے“ وزیر نے کہا۔ ”بچ بچ بتاؤ، تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ جہاں تم پیٹرول پمپ لگا رہے ہو، وہاں زمین میں پیٹرول موجود ہے؟“

مرسلہ: اوجد الہی، حضور، ضلع اٹک

”تین چار ہفتے؟“ میں چیخ پڑا۔ ”میں ایک دن بھی وہاں نہیں ٹھہر سکتا۔“

”پھر وہی سوالیہ نگاہ مجھ پر مرکوز ہو گئی۔ ”ڈاکٹر صاحب! میرا خیال ہے کہ آپ کو اتنا توقف تو کرنا ہوگا۔ ہمیں آپ کو موجودہ جگہ سے نہیں ہٹانا چاہیے مگر آپ کی خواہش ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، آپ کا کام ہو جائے گا۔“

”میں وہاں کھڑا ہونٹ کا تار ہل۔ میرا ارادہ انکار کر دینے کا تھا لیکن وہ ہوشیار آدمی تھا۔ میرے تلخ جواب کا اندازہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ”آپ ایک سادہ سادہ زندگی گزار رہے ہیں اور یہ بات کسی کو اعصابی کم زوری میں مبتلا کر دینے کے لیے کافی ہے۔ ہم سب حیران تھے کہ آپ نے کبھی چٹختی نہیں لی، آپ کبھی یہاں ہمارے پاس نہیں آئے۔ گاہے بگاہے خوش مذاق لوگوں کی محفل میں شرکت آپ کے لیے بہت اچھی ثابت ہوئی۔ آج شام گورنمنٹ ہاؤس میں ایک استقبال ہے، کیا آپ چلیں گے؟ ساری نوآبادی کے معززین وہاں ہوں گے اور اُن میں سے اکثر نے آپ کے متعلق دریافت کیا ہے اور آپ سے متعارف ہونے کے مشتاق ہیں۔“

”میں اس بات پر چونکا کہ لوگوں نے میرے متعلق پوچھا

ہے اور مجھ سے متعارف ہونے کے مشتاق ہیں، کیا وہ عورت بھی انہی میں سے ہے؟ یہ خیال میرے لیے شراب کی طرح کیف آور تھا۔ میں نے ریزیڈنٹ کا شکریہ ادا کیا اور دعوت میں قبل از وقت پہنچنے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔

”اور میں واقعی وقت سے پہلے وہاں پہنچ گیا، وقت سے بہت پہلے۔ میری بے صبری اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ میں سب سے پہلے ریزیڈنٹ کے بڑے ڈرائنگ روم میں جا پہنچا۔ پندرہ منٹ تک میں اکیلا اس خاموشی کا مہمان رہا جو وہاں پھیلی ہوئی تھی پھر سرکاری مہمان آنا شروع ہو گئے۔ کچھ سرکاری افسرانہ بیویوں کے ساتھ آئے پھر ریزیڈنٹ بھی آچکا۔ اس نے بڑے تپاک سے میرا خیر مقدم کیا اور میرے ساتھ طویل گفتگو میں مصروف ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے آخر تک اس سے صحیح طرح گفتگو کی پھر یک لحظ میری اعصابی کم زوری عود کر آئی اور میں لڑکھڑانے لگا۔

”وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ عین اسی وقت ریزیڈنٹ مجھ سے گفتگو ختم کر کے ایک اور آدمی سے باتیں کرنے لگا ورنہ شاید میں اس کی طرف ٹھیک سے نہ دیکھ پاتا۔ وہ ایک طرف کچھ لوگوں میں بیٹھ کر شوخ و شنگ ہو کر باتیں کرنے لگی۔ وہ ہنسنے میں بہت احتیاط برت رہی تھی۔ میں اس کے قریب ہوتا چلا گیا لیکن اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ اس کی شوخی نے ایک بار پھر مجھے پاگل کر دیا کیوں کہ میں جانتا تھا، یہ ہنسی بالکل مصنوعی ہے۔ میں نے سوچا، آج بدھ ہے اور سینچر کو اس کا خاندان واپس آ رہا ہے، یہ کس طرح اتنی بے فکری سے ہنس سکتی ہے۔

”دوسرے کمرے سے سازدوں کی آواز آئی۔ رقص شروع ہونے والا تھا۔ اوسط عمر کے ایک آدمی نے اسے اپنا ساتھی بنالیا۔ جن لوگوں سے وہ گفتگو کر رہی تھی، ان سے معذرت کرتے ہوئے اس نے اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑ لیا اور رقص کے کمرے میں چلی گئی۔ رقص کے دوران وہ میرے قریب آگئی اور مجھے دیکھے بغیر نہ رہ سکی۔ بیشتر اس کے کہ میں یہ فیصلہ کر پاتا، مجھے واقفیت کا اظہار کرنا چاہیے یا نہیں، اس نے دوستانہ انداز میں مجھے سلام کیا اور میرے قریب سے گزر گئی۔ کوئی شخص گمان نہیں کر سکتا تھا کہ اس اتفاقی نظر میں کیا کچھ مضمر تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں خود بوکھلا گیا۔ اس نے کیسے اتنی بے باکی سے مجھے پہچان لیا تھا۔ کیا وہ صلح کے لیے پیش قدمی کر رہی تھی؟

”وہ رقص کرتی رہی اور میں اسے دیکھتا رہا۔ ایک قسم اس کے ہونٹوں پر کھیل رہا تھا مگر میں جانتا تھا کہ اس لمحے وہ رقص کے متعلق نہیں بلکہ اس چیز کے متعلق سوچ رہی ہے جس کے

بارے میں خود میں سوچ رہا ہوں اور یہ ایک خوف ناک راز ہے جو صرف ہم دونوں جانتے ہیں، اس خیال سے میری ہمت اور پریشانی فزوں تر ہو گئی۔ میں نہیں جانتا کہ آیا اس وقت کوئی اور شخص بھی مجھے دیکھ رہا تھا لیکن مجھے یقین ہے کہ میرا اشتیاق آمیز تجسس اس کی ظاہری بے پروائی کی وجہ سے بہت نمایاں تھا، میں اس کے سوا کسی اور جانب دیکھ ہی نہیں سکتا تھا کیوں کہ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کب یہ نقاب اتارتی ہے، خواہ ایک لمحے کے لیے سہی۔ میری نگاہ اس پر اس طرح مرکوز ہو جانا اسے یقیناً گوارا گزرا۔ چنانچہ وہ اپنے ساتھی کے بازوؤں میں واپس پہنچی، اس نے مجھ پر ایک نظر ڈالی جو آمرانہ اور خشمگین ہونے کے ساتھ ساتھ اس حکم کی تہمت تھی کہ مجھے اپنے آپ پر کچھ زیادہ ضبط کرنا چاہیے۔

”میں نہیں کہہ سکتا کہ میں وہاں کتنی دیر کھڑا رہا۔ شاید اب تک! میں بالکل مسحور ہو چکا تھا۔ آخر اس کے لیے میری موجودی ناقابل برداشت ہو گئی تو دفعۃً اس نے اپنی گفتگو ختم کر دی اور ایک دل توڑ مصنوعی بیزاری سے کہا۔ ”میں کچھ تھکی ہوئی ہوں اس لیے ذرا جلدی گھر لوٹنا چاہتی ہوں اور آپ لوگوں سے معذرت خواہ ہوں۔ لہذا، شب بخیر۔“

”ڈرائنگ روم روشنی سے منور ہونے کے باوجود تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ زیادہ تر لوگ دوسرے کمرے میں رقص کر رہے تھے اور ایسے لوگ جو رقص کا شوق نہیں رکھتے تھے، تاش کھیلنے کے لیے میزوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اکاڈکا گردہ ادھر ادھر باتیں کر رہے تھے۔ وہ اس وسیع کمرے سے بڑے تمکنت اور وقار کے ساتھ گزری، اس کی خوش خرامی نے مجھے خوشی سے منور کر دیا۔ وہ مسکراتے ہوئے کبھی ایک طرف الوداع کہتی، کبھی دوسری طرف۔ یہاں تک کہ وہ کمرے کے آخر تک پہنچ گئی اور کمرے سے بھڑکنے ہی والی تھی کہ اچانک مجھے خیال آیا، یہ پھر بچ نکلے گی۔ میں نے اس کے پیچھے بھاگنا شروع کیا، جی ہاں بھاگنا شروع کیا۔ میرے جوتے فرش سے ٹکرا کر شور پیدا کر رہے تھے۔ ہر شخص نے مجھے گھور کر دیکھا اور میں ندامت سے عرق عرق ہو گیا، اس کے باوجود رک نہ سکا، وہ جیسے ہی دروازے پر پہنچی، میں نے اسے جالیا۔ وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔ اس کی آنکھیں غصے سے دھبہ رہی تھیں اور نتھنے نفرت و حقارت سے کانپ رہے تھے۔ لیکن اس میں اپنے آپ پر قابو پانے کی قوت موجود تھی جس کا مجھ میں افسوس ناک حد تک فقدان تھا۔ ایک لمحے میں اس نے اپنے غصے پر قابو پالیا اور بے اختیار ہنس پڑی۔ کمال ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے اس نے بلند آواز میں بولنا شروع کر دیا تاکہ دوسرے بھی سن سکیں۔ ”تو ڈاکٹر صاحب! آپ کو میرے غصے کا نسخہ اب سب تک

یاد آیا ہے۔ آخر سائنس دانوں کو کبھی کبھی نسیان ہو ہی جاتا ہے۔

کیوں جناب ایسا ہی ہے نا؟

”پاس ٹھیرے ہوئے دو آدمیوں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ میں نے دل ہی دل میں اس کی ذہانت کی داد دی کہ اس نے کتنے سلیقے سے میرا گاد دی پن بچھپالیا ہے۔ میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ میں نے اپنی جیب سے ڈائری نکالی جس میں کچھ نسخے تھے، ڈائری سے ایک صفحہ پھاڑ کر میں نے اسے دے دیا اور معذرت کے الفاظ بھی کہے۔ ایک لطیف مسکراہٹ سے اس نے کاغذ لیتے ہوئے مجھے شب بخیر کہا اور چلی گئی۔

”اس نے معاملہ دگرگوں ہونے سے بچالیا تھا لیکن حالات بڑے مایوس کن تھے۔ وہ مجھ سے میری حماقت کی وجہ سے متنفر ہو گئی تھی اور مجھے موت سے بھی زیادہ حقارت سے دیکھتی تھی۔ میں جتنی دفعہ اس کے پاس گیا، اس نے مجھے کتنے کی طرح دھتکار دیا۔

”کھانے کی میز پر جا کر میں نے یکے بعد دیگرے چار گلاس برانڈی کے پی لیے۔ میرے اعصاب پھیپھڑوں کے مانند ہو رہے تھے اور برانڈی کی اتنی مقدار کے سوا کوئی شے انھیں بحال نہیں کر سکتی تھی۔ پھر میں ایک قریبی دروازے سے چور کی طرح چپکے سے باہر کھسک گیا۔

”پھر میں نے کیا کیا؟ مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں ایک شراب خانے سے دوسرے شراب خانے میں گیا اور اپنے آپ کو بے خود بنانے کی کوشش کرتا رہا لیکن کوئی شے میری شدتِ احساس ختم نہ کر سکی۔ میں ابھی تک وہ قہقہہ سن رہا تھا جس نے مجھے دیوانہ کر دیا تھا اور وہ مصنوعی قہقہہ بھی جس سے اس نے میرا گولہ پن چھپالیا تھا۔ اسی پریشانی میں، میں ہوٹل کی طرف چل پڑا۔

”میں فرض کے احساس تلے دبا ہوا تھا۔ فرض کا خبیث احساس! یہ خیال مجھے دیوانہ کیے دے رہا تھا کہ شاید اب بھی اسے میری ضرورت ہو بلکہ مجھے یقین تھا کہ اسے میری ضرورت ہے۔ ابھی جمعرات کی صبح تھی۔ دو دن بعد اس کا خلود واپس آنے والا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ مغرور عورت وہ مذاق کبھی گولہ نہیں کر سکے گی جو راز فاش ہونے پر اس کے ساتھ ہو گا۔ میں اپنے کمرے میں کئی گھنٹے اسی خیال میں غرق رہا اور اپنی بے خبری اور شدید غلطیوں کو کوستارہا جن کی وجہ سے میرے لیے اس کی امداد کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ میں کس طرح اس تک رسائی حاصل کروں اور کس طرح اسے یقین دلاؤں کہ میرا تمام تر مقصد اس کی زندگی بچانا ہے، لیکن وہ تو مجھ سے ملنے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔ میں خیال ہی خیال میں اس کے آتشیں قہقہے سنتا رہا اور اس کے حقارت و نفرت سے پھڑپھڑاتے ہوئے نتھنے دیکھتا رہا۔ تمام

سب بنگ

سرخ شناس

اردو کے نام ورنہ مرثیہ نگار شاعر

مرزا سلامت علی دیر بہت حلیم

الطبع منکسر مزاج اور صلح کل انسان تھے اور یہ ان کی شخصیت کے وہ پہلو تھے جن کا اعتراف ان کے حامیوں اور مخالفوں سب کو تھا۔ انہیں کی طبیعت میں ایک باعین اور اشتعال پروری تھی اور ان کی آن بان اور بازو مزاجی مشہور تھی۔ مزاجوں کا یہ فرق اپنی مخالف جماعت والوں کے ساتھ دونوں استادوں کے سلوک میں بھی نمایاں تھا۔ دیر کا ایک واقعہ اس طرح ملتا ہے۔

ایک سید صاحب کو کربلائے معلیٰ جانے کے لیے دو سو روپے درکار تھے۔ انہوں نے دیر سے درخواست کی کہ وہ ایک رئیس سے سفارش کر کے، جو انہیں سے خصوصیت رکھتے تھے، انہیں مطلوبہ رقم دلوادیں۔ دیر نے انہیں ساتھ لیا اور رئیس کے یہاں جا کر سفارش کی۔ رئیس نے دو سو کے بجائے چار سو روپے سید کو دیے اور کہا: ”میر صاحب! یہ دو سو روپے تو آپ کے مطلوبہ ہیں اور دو سو روپے اس شکرے میں نذر رسالت کرتا ہوں کہ مرزا صاحب قبلہ کفش خانے پر تشریف لائے۔“

ڈاکٹر نذیر مسعود کی کتاب معرکہ انیس و دہیر سے

عقیل عباس جعفری کی خوشہ چینی

رات ٹٹلتے ٹٹلتے گزر گئی۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ کچھ دیر بعد سورج کی شعاعیں برآمدے میں چپکنے لگیں اور زندگی پھر اپنی ہنگامہ خیزیوں میں مصروف ہو گئی۔

”آخر میں نے اسے خط لکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ خط انتہائی منکسرانہ تھا، اس میں یوں تو دنیا بھر کی باتیں تھیں مگر کوئی خاص بات نہیں تھی، میں نے اس سے معافی کی التجا کی۔ خط میں اپنے آپ کو ایک جنونی اور بیہودہ آدمی تسلیم کیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ مجھ پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو علاج کے لیے میرے سپرد کر دے۔ میں نے قسم کھائی کہ اس کے علاج کے بعد میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میں نے درخواست کی کہ وہ مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے اس نازک ترین وقت میں میری امداد قبول کر لے۔“

”میں نے بیس صفحے لکھ ڈالے۔ یہ ایک حیرت انگیز خط تھا، جیسے کسی پاگل خانے سے یا کسی شراب خانے سے لکھا گیا ہو۔ میں نے خط ختم کیا تو پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ میں نے خط دوبارہ پڑھنے کی کوشش کی تو الفاظ آنکھوں کے سامنے تیرنے لگے۔ میں لفاظ اٹھانے کے لیے اٹھا تو معایاں آیا، میں خط میں کسی ایسی بات کا اضافہ بھی کر دوں جس سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایک دفعہ پھر قلم اٹھاتے ہوئے میں نے آخری صفحے پر ان الفاظ کا اضافہ کر دیا۔ ”میں معافی کے چند الفاظ کے لیے اس ہوٹل میں منتظر رہوں گا۔ اگر شام سے قبل مجھے آپ کی طرف سے کوئی

جواب موصول نہ ہوا تو اپنے آپ کو گولی کا نشانہ بنائوں گا۔“
”خط بند کر کے میں نے نوکر کو آواز دی اور کہا کہ فوراً وہ خط
دے کر آئے۔ اب مجھے جواب کا انتظار کرنے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔“

❏ وقفہ ظاہر کرنے کے لیے وہ کچھ دیر خاموش رہا۔
اُس نے دوبارہ بولنا شروع کیا تو اس کی آواز میں نیا جوش و
خروش تھا۔

”عیسائیت میرے لیے اپنے معنی کھو چکی ہے۔ جنت اور
جہنم کی پرانی روایتیں اب میرے نزدیک کوئی وقعت نہیں
رکھتیں لیکن اگر حقیقت کوئی جہنم ہے تو میں اس سے کوئی خوف
محسوس نہیں کروں گا کیوں کہ میرے انتظار کی گھڑیوں سے
زیادہ عذاب وہ کوئی جہنم نہیں ہو سکتا۔ تنگ کمر ادو پیر کی گرمی
سے بھیجی کی طرح تپ رہا تھا، آپ کو کبھی استوائی علاقے کا کوئی
ہوٹل دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے؟ میز پر میری گھڑی اور پستول کے
سوا کوئی چیز نہیں تھی۔ میں گھڑی کی طرف جھٹکی باندھے دیکھ رہا
تھا۔ کھانے پینے سے حتاکہ سگریٹ تک سے بے نیاز میں بے حس و
حرکت بیٹھا گھڑی تک رہا تھا۔ میری نگاہیں گھڑی کی دوسری
سُئی کو چکر کاٹتے دیکھ رہی تھیں۔ اس حالت میں، میں نے
پورا دن گزارا۔

”میری نگاہیں مسلسل گھڑی پر مرکوز تھیں۔ تین بج کر
بائیس منٹ پر دستک ہوئی۔ ایک مقامی لڑکا کاغذ کا تھپہ شدہ ٹکڑا
کسی لفافے کے بغیر لیے ہوئے اندر آیا۔ میں نے لپک کر وہ اس
سے چھین لیا، لڑکا میرے رقعہ پڑھنے سے پہلے ہی چلا گیا۔ پہلے
پہل تو میں وہ مختصر پیغام پڑھ بھی نہ سکا۔ یہ اس کا جواب تھا۔
الفاظ میری آنکھوں کے سامنے سرپٹ بھاگنے لگے۔ کوئی مطلب
میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اپنے حواس بحال کرنے اور جھلسلے سے
لکھا ہوا رقعہ سمجھنے سے مجھ میں نے ذہنی انتشار اور سر اسیمگی کو
سکون دینے کے لیے اپنا سر ٹھنڈے پانی سے تر کیا۔

”اگرچہ بہت دیر ہو چکی ہے تاہم آپ ہوٹل میں انتظار
کیجیے، شاید مجھے آخر میں آپ کو بلانے کی ضرورت محسوس ہو۔“
”اس مُوے مُوے ہوئے لمبے لمبے پر کسی کے دستخط نہیں
تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کاغذ کا یہ پُرزہ کسی اشتہار سے پھاڑا
گیا ہے۔ تحریر بھی رواں نہیں تھی، شاید جذبات کی برا بیخستگی
کی وجہ سے ایسا ہو یا ہو سکتا ہے کہ رقعہ گاڑی میں بیٹھ کر لکھا
گیا ہو، بہر حال اس کے متعلق میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔
البتہ ایک بات میں رقعہ پڑھ کر بھانپ گیا، پریشانی، غلٹ اور خوف
اس تحریر پر مرسم تھے۔ خط نے مجھے انتہائی خوف زدہ کر دیا لیکن

میں خوش تھا کہ چلو، اس نے جواب تو دیا۔ مجھے زندہ رہنا چاہیے
اس لیے کہ شاید اسے میری ضرورت ہو، ممکن ہے، وہ مجھے امداد
کرنے کی اجازت دے دے۔ میں قیاس و اندیشہ کی دنیا میں کھو گیا۔
”شام ہونے کو تھی۔ دفعۃً میں چونک پڑا، کوئی چھ بجے

ہوں گے۔ میں نے سر پاپا گوش بن کر آواز سننے کی کوشش کی۔ اب
کے آواز بالکل واضح تھی۔ دستک نہایت مذبذب طور پر مگر مسلسل
ہو رہی تھی۔ میں بے چینی سے دروازے کی طرف لپکا۔ دروازے
پر چینی لڑکا کھڑا تھا۔ روشنی اتنی تھی کہ نہ صرف میں ضربات
کے نشان بلکہ اس کی سیاہ آنکھیں، زخمی ٹھوڑی اور اس کے
بھرے کاخاستری مائل رنگ بھی دیکھ سکتا تھا۔ اُس نے صرف
لٹکا کہا۔ ”صاحب جل..... دی آئے۔“

”میں میٹر ہیوں سے نیچے لپکا۔ لڑکا میرے پیچھے تھا۔ ایک
بھی ہماری منتظر تھی۔ ہم اس میں سوار ہو کر چل پڑے۔ جیسے
بھی بکھی چلی، میں نے کوچوان کو کوئی حکم دیے بغیر چینی لڑکے
سے پوچھا۔ ”کیا معاملہ ہے؟“

”لڑکے نے میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ بھیج
گئے، اس نے ایک لفظ نہیں کہا۔ میں نے اپنا سوال پھر دہرایا مگر
بے سود۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کسی صورت میں نہیں بولے گا۔

”بکھی ایک تنگ کلی میں ایک بوسیدہ مکان کے سامنے
رک گئی۔ یہ کچھ منٹوں سی جگہ تھی۔ سامنے ایک چھوٹی سی دکان
تھی جس میں موسم بقی چل رہی تھی۔ قریبی عمارت میں ایک غلیظ
سما ہوٹل تھا جو اُن قمار خانوں، چٹکوں اور نان بائیوں کی دکانوں
میں سے ایک تھا جو معمولی درجے کے چینی، مشرق کے تمام بڑے
بڑے شہروں میں چلاتے ہیں۔

”لڑکے نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ ایک دو انچ
کے برابر کھلا اور اندر ایک آکتا دینے والی گفت و شنید شروع
ہو گئی۔ میں بے تابی کے ساتھ گاڑی سے ٹوڈ پڑا۔ دروازہ میں نے
کھدھے سے کھولا۔ ایک بوڑھی چینی عورت چیخ مار کر میرے
سامنے سے نکل۔ میں بھاگ کر ایک طرف ہو گیا۔ چینی لڑکا آیا
اور مجھے اپنے ساتھ لے کے چلا۔ ہم ایک دوسرے دروازے پر
پہنچے، میں دروازہ کھول کر ایک تاریک کمرے میں پہنچ گیا، یہاں
برانڈی اور خون کے بھیکے نکل رہے تھے اور کوئی پڑا کر اور ہاتھ
میں اندھیرے میں کچھ نہ دیکھ سکا اور آواز کی طرف انکل سے
بڑھا۔ وہ وہاں پڑی تھی۔ ایک میلی میلی چٹائی پر پڑی وہ درد سے
ڈہری ہو رہی تھی اور سسکیاں بھر رہی تھی۔ کمر اس قدر تاریک
تھا کہ میں اُس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ میں نے اپنا ہاتھ پھیلا یا، میرا
ہاتھ اس کے ہاتھ پر پڑا جو حرارت سے تپ رہا تھا۔ اسے بہت تیز
سب بھگ

قدر گوهر

اقتباس مضمون، ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی

اپنے عہد کے نامور فلسفی، طبیب اور سائنس دان ابو علی سینا اور مشہور صوفی بزرگ اور شاعر مولانا ابو سعید ابوالخیر، ہم عصر وہم عمر تھے۔ دونوں حق شناسی و حقیقت شناسی کے مدعی تھے اور غیر معمولی شہرت رکھتے تھے، دونوں کے تلامذہ اور مریدوں کا ایک بڑا حلقہ تھا۔ دونوں بزرگوں کے مابین علمی مسائل پر مکالمہ و معارضہ بھی ہوا کرتا تھا۔ ایک دفعہ مجمع عام میں مکالمہ ہوا اور حقیقتِ اولیٰ کی ماہیت و اصلیت کے بارے میں خوب نوک جھونک رہی، آخر میں ابو علی سینا نے ابو سعید ابوالخیر کے علم و فضل کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا: ”میرے اور ان کے علم میں بڑا فرق ہے، میں جو کچھ سوچ رہا ہوں، وہ اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں۔“

• ڈاکٹر فرمان فتح پوری

کی چمک اور اس کے عینک کے شیشوں کا عکس دیکھ سکتا تھا۔ وہ اتنے جوش اور غصے سے بول رہا تھا کہ مجھے اس کی آواز پہنکارنے اور چیخنے کے بچ کی کوئی نئی چیز لگی۔

”آپ ایک اجنبی ہیں جسے میں نے دن کی روشنی میں کبھی نہیں دیکھا۔ آپ جو اتنے اطمینان سے دنیا کا سفر کر رہے ہیں، کیا یہ جانتے ہیں کہ کسی کو مرتے ہوئے دیکھنا کیا ہوتا ہے؟ کیا آپ نے کبھی کسی کو نزع کے کرب میں دیکھا ہے؟ کیا آپ نے کبھی کسی مرنے والے کا جسم سینٹے اور سکڑتے دیکھا ہے؟ کیا آپ نے کسی قریب المرگ شخص کے گلے میں انکی ہوئی آواز سنی ہے؟ کیا آپ نے کبھی کسی مرنے والے انسان کی آنکھوں کا ناقابل بیان خوف دیکھا ہے؟ آپ جو ایک بے فکرے جہاں گرد ہیں، کیا آپ کو کبھی ایسا ہیبت ناک منظر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے؟

”ہاں، میں نے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اکثر ایسے مناظر دیکھے ہیں، لیکن اس کا صحیح مشاہدہ عمر بھر میں صرف ایک بار کیا ہے۔ زندگی میں صرف ایک بار میں کسی کے ساتھ جیا ہوں اور کسی کے ساتھ مرا ہوں، پوری زندگی میں صرف ایک مرتبہ اور وہ اس وقت جب مہیب بیداری میں آج سے کچھ دن پہلے میں اس کا خون روکنے کے لیے اور اس کے بخار کی حدت کم کرنے کے لیے سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ موت میری آنکھوں کے سامنے عبورت کو کھائے جا رہی تھی اور اس کے سر پر منڈ لار ہی تھی۔“

بخلا تھا، مجھے احساس ہو گیا کہ کیا ہو چکا ہے، میں لرز اٹھا۔ اس خدمت کے لیے اسے مجھ پر اعتماد نہیں تھا۔ علاج کے لیے اس نے اپنے آپ کو میرے حوالے کرنے کے بجائے اس چڑیل کے حوالے کر دیا تھا جسے میں نے دروازے سے داخل ہوتے وقت دیکھا تھا۔ اس نے ایک اُجڑ دلیا کے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاک کر لیا تھا۔

”میں روشنی کے لیے چیخا، وہ ملعون چڑیل ایک بدبودار تیل کا لیمپ لے آئی۔ میرا جی چاہا کہ اس کا گلا گھونٹ دوں لیکن اس سے کیا فائدہ ہوتا؟ اس نے لیمپ میز پر رکھ دیا۔ لیمپ کی دھیمی روشنی میں، میں اس کا جسم دیکھ سکتا تھا۔ ایک دفعہ میں پھر ڈاکٹر بن گیا، علم اور تجربے کا پیکر جسے اپنی طرح کے ایک مصیبت زدہ فانی انسان کی بھلائی کے لیے اپنی اہلیت بروئے کار لانے کے لیے پکارا گیا تھا۔ میں اپنا ناپاک وجود بھول گیا اور اپنی بیدار شدہ ذہانت کے ساتھ تباہی کی طاقت سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے برہنہ جسم پر رکھ دیا جس کے لیے کچھ دن پہلے میں نہایت بواہوس ہو رہا تھا۔ اب یہ ایک مریض کا جسم بن چکا تھا اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں نے اس کا جسم زندگی کے ایک ایسے مسکن کے طور پر دیکھا جو موت سے برسرِ پیکار تھا۔ میں نے ایک ماہر کی طرح خطرے کی شدت کا اندازہ لگایا۔ میں نے دیکھا کہ بازی ہاری جا چکی ہے، اب اسے کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے۔ اسقاطِ اتنی بری طرح کیا گیا تھا کہ خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ وہاں کیا تھا جسے میں خون روکنے کے لیے استعمال کرتا؟ ہر وہ شے خون آلودہ تھی جس پر میری نگاہ پڑتی یا جسے میں چھوتا۔ مجھے وہاں صاف پانی اور سپنجی تک میسر نہ تھی۔ میں نے اس سے کہا، آپ کو فوراً اسپتال لے جانا ضروری ہے، اس پر اس کے ذہنی کرب نے اس کے جسمانی کرب میں اضافہ کر دیا، چیخ اٹھی۔ ’نہیں، نہیں، نہیں۔ میں مر جانا پسند کروں گی۔ اس بات کا کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی کسی کو خبر نہیں ہونی چاہیے مجھے گھر لے چلو۔“

”میں سمجھ گیا کہ اسے اپنی زندگی سے اپنی عزت زیادہ عزیز ہے۔ میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ چینی لڑکا ایک پاگل لے آیا، ہم نے اسے اس پر اٹھایا اور نیم مردہ حالت میں، رات کی تاریکی میں گھر لے گئے۔ پھر ایک کش مکش شروع ہوئی موت کے ساتھ زندگی کی طویل کش مکش لیکن.... بے سود۔ آہ.....

اُس نے میرا بازو اس بری طرح بھینچا کہ درد اور حیرت سے اپنی چیخیں روکنا میرے لیے مشکل ہو گیا۔ اس کا چہرہ میرے اس قدر قریب تھا کہ میں تاروں کی روشنی میں اُس کے دانتوں

”طب اور علم اودہ پر عبور رکھنے کے باوجود اپنے جیسے فانی انسانوں کی امداد اپنا اولین فرض سمجھتے ہوئے، کسی کے بستر مرگ پر بے بس ہو کر بیٹھنا اور صرف اتنا جاننا کہ اسے کوئی مدد نہیں دی جاسکتی، کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کتنا بڑا عذاب ہے۔ نبض ابھرتے اور ڈوبتے ہوئے محسوس کرنا کیسا دکھ ہے اور پھر میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، میں اسے اسپتال نہیں لے جاسکتا تھا جہاں اسے بچانے کی کوئی صورت کی جاسکتی۔ میں باہر سے کسی تعاون کا انتظام نہیں کر سکتا تھا صرف بیٹھ کر اسے مرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ امداد کے لیے میں بے معنی دعائیں پڑھتا اور غصے سے مٹھیاں بھیج کر رہ جاتا۔“

”آپ سمجھ رہے ہیں نا؟ محسوس کر رہے ہیں نا؟ میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ انسان ایسے لمحات کے بعد زندہ کیسے رہ جاتا ہے؟ آخر مرنے والے کے ساتھ مریکوں نہیں جاتا؟ ایک ایسی ہستی جس کے لیے میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھا، مجھ سے جدا ہو کر ایسی جگہ جا رہی تھی جہاں سے اسے واپس نہیں بلایا جاسکتا تھا۔ میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر خاموش اور بے بس تھا۔“

”اس حالت میں ایک دکھ اور ہوا۔ میں بستر کے پاس بیٹھا تھا۔ میں نے اس کا درد کم کرنے کے لیے اسے مارفین کا ٹیکا لگا دیا تھا، اب وہ بالکل خاموش لیٹی تھی، اس کے شعلہ رخسار اکھ کے مانند ہو گئے، معاً اس طرح محسوس ہوا جیسے کوئی ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں نے نوکر دیکھا، چینی لڑکا پاؤں پیدائے اپنی زبان میں دعا کر رہا تھا۔ جب بھی میں اس کی طرف دیکھتا، اس کی ملتجیانہ نگاہیں ایک شکری کتے کی طرح مجھ پر پڑتیں۔ وہ خاموشی سے مدد کا طلب گار تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ اس طرح میری طرف اٹھائے جیسے کسی دیوتا سے گڑگڑا کر دعا مانگ رہا ہو، میری طرح جو ایک بالکل بے بس اور ناتواں انسان تھا، جسے یہ بھی معلوم تھا کہ اب ساری تنگ و دو لا حاصل ہے، جسے اس بات کا بھی مکمل عرفان تھا کہ اس کی وقعت فرش پر ریگنے والے ایک کیڑے سے زیادہ نہیں ہے۔“

”پہرے پر بٹھائے ہوئے جانور کی طرح وہ میرے پیچھے بیٹھا تھا۔ میں کوئی چیز اس سے مانگتا، وہ اسے لانے کے لیے بے تاب ہو جاتا، اس خیال سے کہ شاید جو کچھ میں نے مانگا ہے، وہ مالن کی زندگی بچانے کے لیے کارگر ہو سکتا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس کی زندگی بچانے کے لیے اپنا خون تک دے دیتا۔ میں خود بھی خون دینے کے لیے خوشی سے تیار تھا مگر انتقال خون سے کیا حاصل تھا، خواہ اس کا سامان بھی میرے پاس ہوتا۔ انتقال خون سے تو اس کے کرب میں اور اضافہ ہو جاتا۔ وہ چینی

لڑکا اور میں جان تک قربان کر دینے کے لیے تیار تھے لیکن میری بے بسی کا یہ عالم تھا کہ میں اس کا بہتا ہوا خون روکنے سے قاصر تھا جو اسے موت کے منہ میں لیے جا رہا تھا۔“

”سورج طلوع ہونے سے قبل وہ خواب آور دوا کے اثر سے بیدار ہوئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھوں میں اب نخت اور سرد مہری نہیں تھی۔ وہ کمرے میں ادھر ادھر نظر دوڑاتی تو اس کی آنکھیں بخار کی حدت سے چمک اٹھتیں۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے کچھ پریشان سی ہوئی، اس نے یہ یاد کرنے کی کوشش کی کہ میں کون ہوں، پھر اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اس نے پہلے مجھے دشمن کے طور پر دیکھا پھر آہستہ سے اپنا ہاتھ اس طرح ہلایا جیسے مجھے دھتکار رہی ہو اور اپنی حرکات سے یہ ظاہر کیا کہ اگر اس میں کچھ طاقت ہوتی تو وہ مجھ سے دور بھاگ جاتی۔ پھر اس نے اپنے خیالات مجتمع کیے اور کسی قدر سکون سے میری طرف دیکھا۔ اسے سانس لینے میں کافی دقت ہو رہی تھی۔ وہ بولنے کی کوشش کرتی، اٹھ کر بیٹھنا چاہتی مگر کم زوری کی وجہ سے بالکل نڈھال تھی۔ اسے اٹھنے کی کوشش سے باز رہنے کی التجا کرنے کے لیے میں اس پر جھک گیا تاکہ اس کی خیف ترین آواز بھی سن سکوں۔ میرے ساتھ اس کا سلوک ہم دردانہ اور رحم دلانہ ہو گیا۔ اس کے لیوں میں جنبش ہوئی اور اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”جیسی کو اس بات کی خبر نہ ہو، بالکل نہیں۔“

”نہیں ہوگی۔“ میں نے دلی اعتماد سے کہا۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا۔“

”اس کی آنکھیں اب بھی بے چین تھیں۔ بڑی کوشش کے بعد اس نے یہ الفاظ کہے۔ ”قسم کھاؤ۔“

”میں نے مسرت سے ہاتھ اٹھایا۔ ”قسم کھاتا ہوں۔“

”وہ اگرچہ بہت کم زور تھی، تاہم اس نے مجھے خوش دلی سے تشکر سے دیکھا۔ مجھ سے پہنچنے والی اذیت کے باوجود اب وہ میری ممنون تھی، اس نے اس کا اظہار ایک لطیف مسکراہٹ سے کیا۔ کچھ دیر بعد اس نے پھر بولنے کی کوشش کی لیکن بول نہ سکی۔ اس کی آنکھیں بند کر کے آرام اور سکون کی ابدی نیند سو گئی۔ آہ، دن کی روشنی کمرے میں ظاہر ہونے سے قبل سب کچھ ختم ہو گیا۔“

بہت دیر تک سکوت طاری رہا۔ اب اس نے اپنے جنون کی لہر پر قابو پالیا تھا جس کی وجہ سے اس نے میری کھائی پینٹی تھی، وہ تھک کر بیٹھ گیا۔ تارے ماند پڑ رہے تھے۔ تروتازہ ہوا نمود سحر کی پیام برین کر آئی۔ اس نے اپنی ٹوپی اتار رکھی تھی، اب اس کا چہرہ بالکل ظاہر تھا۔ درد اس کے چہرے پر مرتسم تھا۔ اس سب تک

خاموشی اور خود اعتمادی سے کرتا اور اسے اس کی موت کے متعلق یہ کہانی سنا دیتا کہ جب وہ بیمار ہوئی تو اس نے چینی لڑکے کو ڈاکٹر بلا لانے کے لیے بھیجا، لڑکا اتفاقاً مجھے مل گیا۔ جب میں لوگوں سے اطمینان کے ساتھ باتیں کر رہا تھا، مجھے ایک آدمی کا انتظار تھا، وہ وہاں کا سینئر سرجن تھا جسے تدفین سے پہلے لاش کا معائنہ کرنا تھا۔ جمعرات کی صبح ہو چکی تھی اور سینئر کی صبح اس کے خاوند کو واپس آنا تھا۔ تدفین میں غلٹ اس علاقے کا رواج تھا لیکن اصل مشکل ضروری کاغذات پر دستخط کرانے کی تھی جس کا مجاز میں نہیں بلکہ سینئر سرجن تھا۔

”توبہ کے قریب سرجن کی آمد کی اطلاع دی گئی۔ میں نے ہی اسے بلایا تھا، وہ مجھ سے سینئر تھا اور وائس ریزیڈنٹ کی ٹانگ کے علاج سے مجھے جو شہرت حاصل ہوئی تھی، اس کی وجہ سے مجھ سے حسد کرتا تھا۔ یہ وہی ڈاکٹر تھا جس کا تذکرہ آں جہانی نے انتہائی حقارت سے کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ بد رج کھیلنے کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ عام دفتری قاعدے کے مطابق میرے تبادلے کے کاغذات اسی کے توسط سے جانے تھے۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ وائس ریزیڈنٹ پہلے ہی اس سے اس بات کا تذکرہ کر چکا تھا۔

”اس دن ہم ایک دوسرے سے ملے تو میں نے اس کی

ہر قسم کی اردو، انگریزی کتابوں کا مرکز
اسلامی کتب و قرآن پاک کا خصوصی اسٹاک

اگر آپ اپنی کتب چھپوانا چاہیں تو
ویکم بک پورٹ پر رابطہ کریں

**Welcome Book
Port (Pvt.) Ltd.**

Publisher, Exporter, Wholesaler,
Distributor

Main Urdu Bazar, Karachi.

Ph: 2633151-2639581, Fax: 2638086

E-mail: wbp@welbook.com

Internet: http://www.welbook.com

نے اپنی ٹینک کے شیشوں میں سے بہ غور میرا جائزہ لیا۔ غالباً وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جس شخص کے سامنے وہ اپنی چٹا کر رہا تھا، وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ پھر اس نے اپنی کہانی دوبارہ شروع کی۔

”اس کے لیے سب کچھ ختم ہو گیا تھا لیکن میرے لیے نہیں۔ میں اس لاش کے پاس، اجنبی شہر میں اکیلا تھا اور ایک ایسی جگہ، جہاں خبر آگ کی طرح پھیلتی ہے، اس کا راز مخفی رکھنے کا وعدہ کر چکا تھا۔ ذرا آپ خود صورت حال کا اندازہ کیجیے۔ ایک عورت جو نو آبادی کی بہترین سوسائٹی میں اٹھتی بیٹھتی تھی اور بالکل تن درست تھی، جو ایک شام قبل گورنمنٹ ہاؤس میں رقص کر رہی تھی، اب وہ مر چکی تھی اور واجد ڈاکٹر جو اس کے متعلق کچھ جانتا تھا وہ شخص جو موت کے وقت اس کے سر ہانے موجود تھا، اس شہر میں نو وارد تھا اور اسے نوکر کے ذریعے بلوایا گیا تھا۔ ڈاکٹر اور نوکر رات کی تاریکی میں اسے ایک پاکی میں لائے تھے اور باقی سب لوگ اس بات سے قطعاً بے خبر رکھے گئے تھے، صبح تک انہوں نے کوئی دوسرا نوکر نہیں بلایا تھا، نہ یہ بتایا تھا کہ ان کی مالکہ مر چکی ہے۔

”ایک دو گھنٹوں میں اس کے انتقال کی خبر سارے شہر میں پھیل جائے گی اور میں ایک دور دراز کا ڈاکٹر کس طرح اس کی اچانک موت کی وجوہ بیان کروں گا۔ میں انہیں کیا بتاؤں گا کہ میں نے کیا کچھ کیا تھا اور کیا کچھ نہیں کر سکا۔ میں نے یہ ذمہ داری پوری کرنے کے لیے کوئی دوسرا ڈاکٹر کیوں نہیں بلایا؟ کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟ بہر حال مجھے اب جو کچھ کرنا تھا، اس سے بے خبر نہیں تھا، اس کام میں چینی لڑکا میرا واحد مددگار تھا لیکن کچھ بھی ہو، وہ ایک مخلص اور قابل اعتماد خدمت گار تھا جسے اس بات کا مکمل عرفان تھا کہ ابھی ایک جنگ لڑنی باقی ہے۔ میں نے اس سے کہا، کیا تم جانتے ہو تمہاری مالکہ کی آخری خواہش یہ تھی کہ کسی شخص کو اصل واقعے کا علم نہ ہو؟“

”جناب! مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔“

”میں سمجھ گیا کہ اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ اس نے فرش سے خون کے دھبے دھو ڈالے اور ہر چیز ٹھیک ٹھاک کر دی۔ اس کے تحمل نے مجھے بھی تقویت دی۔ مجھ میں نہ کبھی پہلے اتنی قوت موجود تھی، نہ آئندہ ہوگی۔ دراصل جب انسان اپنا سب کچھ کھو بیٹھتا ہے تو اپنی بچی بچی پونجی کے لیے بے جگری سے لڑتا ہے اور اس کے لیے سر دھڑکی بازی لگا دیتا ہے، وہ آخری پونجی جس کے لیے میں برسرِ پیکار تھا، اس کی نشانی تھی اور یہ نشانی اس کا راز تھا۔

”میں تعزیت کے لیے آنے والے ہر شخص کا استقبال

سب ٹیک

دشمنی کا اندازہ کر لیا، اس اندازے نے میرا عزم اور زیادہ راسخ کر دیا۔ جیسے ہی میں انتظار کے کمرے میں اس کے سامنے پہنچا، اس نے نوک جھونک شروع کر دی۔ ”میڈم بلیک کا انتقال کس وقت ہوا؟“

”آج صبح چھ بجے۔“

”انہوں نے آپ کو کب بلوایا تھا؟“

”کل رات۔“

”کیا آپ جانتے تھے کہ میں ان کا باقاعدہ ڈاکٹر ہوں۔“

”جی ہاں۔“

”پھر آپ نے مجھے کیوں نہیں بلوایا؟“

”انتادقت ہی نہیں تھا اور میڈم بلیک نے اپنے آپ کو مکمل طور پر میری نگرانی میں دے دیا تھا اور مجھے کسی دوسرے ڈاکٹر کو بلانے سے قطعی منع کر دیا تھا۔“

”اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا، غصہ دباتے ہوئے اس نے بے پروائی سے کہا۔ ”خیر، اس کی زندگی تک آپ میرے بغیر اس کا علاج کر سکتے تھے تاہم اب آپ نے مجھے بلوا کے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔ اب مجھے اس کی موت کی وجوہ کی تصدیق کر کے اپنا فرض پورا کر لینے دیجیے۔“

”میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اُسے لاش کے کمرے کی طرف بڑھنے دیا۔ ہم وہاں پہنچے، لاش چھوٹے سے قبل میں نے کہا۔ اب سوال موت کی وجوہ کی تصدیق کا نہیں بلکہ وجوہ وضع کرنے کا ہے۔ میڈم بلیک نے اسقاطِ حمل کے سنگین نتائج سے بچنے کے لیے مجھے بلوایا تھا۔ یہ اسقاطِ حمل ایک چینی دلیانے بڑے بھڑے طریقے سے کیا۔ اس کی زندگی بچانا میرے لیے ناممکن تھا لیکن میں نے اس کی عزت بچانے کا اس سے وعدہ کیا ہے اور اس سلسلے میں آپ کی مدد چاہتا ہوں۔“

اُس نے تعجب سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تو آپ مجھ سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ میں صوبے کا سینئر سرجن ہوتے ہوئے جرمِ مخفی رکھنے میں آپ کی مدد کروں؟“

”جی ہاں۔ میں یہی استدعا کر رہا ہوں۔“

”اس نے کسی قدر حقارت کے ساتھ کہا۔ ”در اصل آپ چاہتے ہیں کہ میں یہ جرم چھپانے میں آپ کی مدد کروں جو آپ نے کیا ہے؟“

”میں نے آپ کو بتایا ہے کہ جو کچھ میں نے کیا، مرنے والی کو اس کی عاقبت نااندیشی اور کسی دوسرے شخص کے جرم کے خمیازے سے بچانے کے لیے کیا۔ اگر میں مجرم ہوتا تو اس وقت آپ کے سامنے نہ ہوتا۔ میڈم بلیک نے خود بھاری کفارہ ادا کیا

ہے اور اُس چڑیل کی جس نے اسقاطِ حمل کیا ہے، اس معاملے میں کوئی اہمیت نہیں کیوں کہ آپ متوفیہ کی شہرت کو گزند پہنچائے بغیر اُسے سزا نہیں دے سکتے اور یہ میں کسی صورت میں گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“

”آپ مجھ سے اس طرح گفتگو کرتے ہیں جیسے میرے بجائے آپ افسر ہوں۔ مجھے پہلے ہی یہ بات کھٹکی تھی کہ آپ کے یہاں بلائے جانے کی ضرورت کوئی انوکھی وجہ ہوگی۔ آپ نے اس معاملے میں بے جا مداخلت کر کے خوب ابتدا کی۔ اب میرے لیے صرف اتنا کرنا رہ گیا ہے کہ اس معاملے کی تحقیق شروع کروں اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری رپورٹ حقیقت پر مبنی ہوگی۔ میں اپنا نام کسی غلط سرٹیفکیٹ پر ثبت کرنا نہیں چاہتا۔ آپ کو یہ سوچنا ہی نہیں چاہیے کہ میں ایسا کروں گا۔“

”سر جن صاحب! اس مرتبہ تو آپ کو ایک غلط سرٹیفکیٹ پر دست خط کرنے ہی ہوں گے۔ اگر آپ دست خط نہیں کریں گے تو اس کمرے سے زندہ باہر نہیں جاسکیں گے۔“ میں نے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا، پستول جیب میں نہیں تھا، وہ میں ہونٹ کے کمرے میں چھوڑ آیا تھا لیکن یہ حربہ کارگر ثابت ہوا، سر جن سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھا کے دھمکی اور مصالحت کے طے جلے انداز میں کہا۔ ”مجھے انتہا تک پہنچنے کا افسوس ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ آپ سمجھنے کی کوشش کیجیے، میرے لیے اپنی یا آپ کی زندگی کی وقعت ایک دمڑی کی بھی نہیں۔ میں اس حد تک پہنچ چکا ہوں جہاں میرے لیے اب اس دنیا میں صرف ایک چیز باقی رہ گئی ہے جس کی مجھے پروا ہے یعنی اُس وعدے کا ایفا کرنا جو میں نے مرنے والی سے کیا ہے۔ مجھے اُس کی موت کا اصل سبب صیغہ راز میں رکھنا ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر آپ اس بات کا سرٹیفکیٹ دے دیں کہ اچانک شدید استوائی بخار اختلاجِ قلب پر فوج ہوا اور اُس کی موت واقع ہوئی تو میں ایک ہفتے میں اس علاقے کو خیر باد کہہ دوں گا بلکہ اگر آپ چاہیں گے تو جیسے ہی اس کی میت دفن ہوگی، میں اپنا سرگولی سے اڑا کر خود کشی کر لوں گا، مجھے یقین ہے کہ یہ بات خوب نہج جائے گی اور کوئی بھی لاش کا معائنہ دوبارہ نہیں کرے گا۔ اس بات سے آپ کی تسلی ہو جانی چاہیے۔“

”میری آواز، میرا سارا وجود اُسے کوس رہا تھا کیوں کہ وہ سہم گیا۔ میں ذرا آگے بڑھتا تو وہ اس طرح پیچھے ہٹ جاتا جس طرح لوگ اس آدمی سے بھاگتے ہیں جس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر ہو، ایک ایسے شخص کو دیکھ کر جو باؤلا ہو رہا ہو، وہ بظاہر کچھ مرعوب ہو گیا اور اُس نے اپنا لب و لہجہ بدل لیا۔ اب وہ پہلا سبب

ساختی افسر نہیں تھا جس کے لیے اپنا کما حقہ پر لکیر کے ہم معنی ہو۔ رد و کد کی موبوم سی کوشش کرتے ہوئے اس نے دبے الفاظ میں کہا۔ ”میں نے عمر بھر کسی جھوٹے سرٹیفکیٹ پر دست خط نہیں کیے۔ اگرچہ ایسا سرٹیفکیٹ لکھ دینے کے بعد شاید کوئی اعتراض پیدا ہونے کا امکان باقی نہ رہے تاہم یہ بات مجھ پر عیاں ہے کہ مجھے اس قسم کی بات نہیں کرنی چاہیے۔“

میں نے کہا۔ ”اگرچہ طریقے اور قاعدے کی رو سے آپ کو ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تاہم یہ ایک خاص واقعہ ہے اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ افشائے حقیقت سے ایک زندہ انسان دوزخ کے عذاب میں مبتلا ہو سکتا ہے اور ایک متوفیہ کی ناموس خاک میں مل سکتی ہے۔“

”اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم دونوں ایک میز پر بیٹھ گئے اور بظاہر ایک دوسرے کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آئے۔ ہم نے ایک سرٹیفکیٹ مرتب کیا جو واقعے کی تفصیلات کی بنیاد بنا، اگلے روز اخبارات میں وہ تفصیلات شائع ہوئیں۔ ”سرٹیفکیٹ مرتب ہونے کے بعد وہ کھڑا ہو گیا اور مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”اب آپ کو یورپ جانے والی پہلی ہی کشتی پر روانہ ہونا ہوگا۔ کیا آپ جائیں گے؟“

”بالکل۔ میں آپ سے وعدہ کر چکا ہوں۔“

اپنی سراسیمگی چھپانے اور بیک وقت مطلع کرنے کے لیے وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”یو کو ہاما سے واپس آنے کے بعد بلینک اپنی بیوی کے ہم راہ گھر جانے والا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ بے چارہ اس کی لاش اس کے عزیز واقارب کے پاس انگلستان لے جائے گا۔ وہ ایک دولت مند شخص ہے اور آپ جانتے ہیں کہ دولت مند لوگ اس قسم کی باتیں سوچ سکتے ہیں۔ میں ابھی کفن تیار کرنے کے لیے کہہ دیتا ہوں تاکہ اُسے سر پہ مہر کیا جاسکے۔ اس طرح ہماری فوری مشکلات ختم ہو جائیں گی اور وہ بھی سمجھ جائے گا کہ اس شدت کی گرمی میں اُس کی آمد کا انتظار نہیں کیا جاسکتا تھا اور اگر وہ یہ سمجھا کہ ہم نے انتہائی عجلت سے کام لیا ہے تو بھی وہ اظہار نہیں کرے گا۔“

”وہ چند لمحے پیشتر میرا دشمن تھا مگر اب میرا معاون اور شریک کار تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ بہت جلد مجھ سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا حاصل کر لے گا اور پھر اُسے خود کو اپنی نظروں میں بھی تو حق بہ جانب ثابت کرنا تھا لیکن اس کے بعد اس نے جو کچھ کیا، وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ اس نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہا۔ ”مجھے امید ہے کہ آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔“

بے گھر

میرا باپ اور دادا بھی یکتائے روزگار کردار تھے لیکن میں نے اپنے دادا کے بھائی کے متعلق ایک بات سنی تھی جو کبھی نہیں بھول پاتا۔ وہ ایک درویش مفت انسان تھا۔ ہر رات وہ ملتان میٹھی کے ساتھ نیو کے پتے بھگو کر رکھتا تھا اور منہ اندھیرے دو میل پیدل چلتے ہوئے شکار پور کی لال حویلی کے قریب ایک کنویں پر جا کر نہاتا تھا۔ چاہے کتنی بھی شدید سردی ہو وہ نہانے ضرور جاتا تھا۔

ایک بار وہ جاڑے میں نما کر گھر لوٹا تو اسے قیصر پر ایک چیونٹی نظر آئی۔ اس نے چیونٹی کو احتیاط سے پکڑ کر ایک شیشی میں رکھا اور میری دادی سے کہا۔ ”میں کنویں پر جا رہا ہوں۔“

”کیوں، ابھی تو آئے ہو؟“ میری دادی نے حیرت سے پوچھا۔ ”یہ چیونٹی میرے کپڑوں پر اسی کنویں کے قریب چڑھی ہے۔ اس کا گھر دندا اسی کنویں کے آس پاس ہوگا، میں اسے اس کے گھر پہنچانے جا رہا ہوں۔“ میرے دادا کے بھائی نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”کسی کو بھی اس کے گھر سے بے گھر کرنے جیسا بڑا گناہ دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔“

شیخ الازہری سے ترجمہ: مصطفیٰ ارباب

”آخر اس کا مطلب کیا تھا؟ کیا میں بیمار تھا؟ پاگل تھا؟ میں نے اخلاق اس کے لیے دروازہ کھولا اور اسے الوداع کہا، ساتھ ہی میری تمام تر تمت جواب دے گئی۔ کمر اچھے گھومتا محسوس ہوا اور میں اس کے بستر کے قریب گر پڑا۔ بالکل اس طرح جیسے کوئی دیوانہ گولی کا نشانہ بننے سے ڈھیر ہو جاتا ہے؟“

”مجھے کچھ پتا نہیں کہ میں کتنی دیر فرش پر پڑا رہا۔ آخر کمرے میں چل پھل کی آواز سے میں جاگا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو چینی لڑکا میرے قریب کھڑا تھا۔ وہ بے چینی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”کوئی آدمی آیا ہے، وہ مالکہ کو دیکھنا چاہتا ہے۔“

”تم کسی کو اندر مت آنے دینا۔“

”لیکن حضور!“

وہ کچھ دیر کے لیے جھجکا اور خوف زدہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے بولنے کی ناکام کوشش کی۔ ظاہر ہے کہ وہ بے چارہ بڑی مصیبت میں تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”کون ہے وہ شخص؟“ لڑکا اس طرح کانپنے لگا جیسے کتا ٹھوکر سے ڈر کر کانپنے لگتا ہے۔ اس نے کوئی نام نہیں لیا۔ ایک شائستگی نے جو مقامی نوکروں میں ناپید ہوتی ہے، اسے اس شخص کا نام لینے سے باز رکھا۔ اس نے بڑی سادگی سے مجھے جواب دیا۔ ”وہ اس مرد سے وابستہ تھی۔“

https://www.facebook.com/groups/372605677178945/

”اُسے زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ میں سمجھ گیا اور اس نامعلوم شخص کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہو گیا جس کا وجود میں قطعی فراموش کر چکا تھا۔ یہ بات شاید آپ کے لیے تعجب کا موجب ہو لیکن اُسی وقت سے میں نے اس آدمی کا خیال حافظے سے نکال دیا تھا جب متوفیہ نے مجھے پہلی مرتبہ اپنے راز سے آگاہ کیا تھا اور میری نامعقول شرط مسترد کی تھی۔ غلت، پریشانی اور بے درپے واقعات کی وجہ سے میرے ذہن سے یہ بات اتر گئی تھی کہ اس تمام سائے میں ایک اور شخص بھی ملوث ہے اور وہ آدمی اس عورت کا محبوب ہے۔ یہ وہ خوش بخت تھا جسے مرنے والی نے والہانہ طور پر وہ سب کچھ دیا تھا جو مجھے نہیں دیا۔ ایک روز پیشتر شاید میں اس شخص سے نفرت کرتا اور اسے گلے گلے کر دیتا پسند کرتا لیکن اب میں اسے دیکھنے کے لیے مضطرب اور بے قرار ہو گیا کیوں کہ مجھے اُس سے اُنس محسوس ہو رہا تھا۔ ہاں، مجھے اس شخص سے اُنس محسوس ہو رہا تھا جسے مرنے والی نے چاہا تھا۔

”میں ایک جست میں ملاقات کے کمرے میں جا پہنچا، خوش نما بالوں والا ایک نو عمر خوب رُوا فر وہاں کھڑا تھا۔ دبلے جسم کا زرد رُونا جوان جو ابھی بہ مشکل لڑکپن کی حدود سے نکلا تھا۔ ایک دل پزیر انداز سے وہ اپنے آپ کو مصنوعی متانت اور سنجیدگی کے ذریعے جوان ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سلام کرتے وقت اس کا ہاتھ لرز گیا۔ میرا دل چاہا کہ اس سے بغل گیر ہو جاؤں کیوں کہ وہ بعینہ، ویسا آدمی تھا جیسا میں نے اس نازنین کے محبوب کے طور پر اپنے ذہن میں مرتب کیا تھا، وہ کوئی ایسا شخص نہیں تھا جسے عورتیں پھسلانے اور رام کرنے میں مہارت ہو بلکہ اس کے برعکس وہ ایک ایسا لڑکا تھا جسے عورت نے خود اپنی محبت کے قابل سمجھا تھا۔ وہ میرے سامنے نام کھڑا تھا۔ میری دفعۃً آمد اور میری تجسس آمیز نگاہ نے اُس کے اضمحلال میں اضافہ کر دیا۔ اس کے چہرے پر کچھ اضطراب نمودار ہوا، معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی ردے گا۔

”میں مداخلت کرنا نہیں چاہتا مگر ایک بار میڈم بلیک کو دیکھنے کے لیے بُری طرح بے تاب ہوں۔“ میں اپنی حرکات سے بے نیاز، کندھے پر ہاتھ رکھے رکھے اسے دروازے کی طرف لے گیا۔ اُس نے تعجب اور عقیدت کے ملے جلے جذبات سے میری طرف دیکھا۔ اس وقت ہم دونوں میں جذبات کی ناقابل یقین یگانگت تھی۔ ہم ایک ساتھ عورت کے بستر مرگ کی جانب بڑھے۔ وہ ابدی غنیمت سورہی تھی۔ چہرے، شانے اور بازوؤں کے سوا اُس کا سارا جسم سفید کفن میں ڈھنپا ہوا تھا۔ اس

خیال سے کہ شاید میری موجودی اسے ناگوار ہو، میں اس سے کچھ فاصلے پر ہو گیا۔ یک لخت وہ گر پڑا، بالکل اُسی طرح جیسے میں گرا تھا۔ گتھنوں کے پلٹ گرے ہوئے اپنے جذبات کے اظہار میں کوئی محنت محسوس کیے بغیر وہ زار و قطار رونے لگا۔

”میں نے اُسے اس کے پاؤں پر کھڑا کیا اور صوفے کی طرف لے گیا۔ ہم دونوں بیٹھ گئے کسی دینے کے لیے میں اس کے بھورے بالوں میں ہاتھوں سے کھجی کرتا رہا، اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور محبت سے دبا کر کہا۔ ”ڈاکٹر! بیج جاؤ، اسے کیا ہوا ہے؟ کہیں اس نے خود کشی تو نہیں کی؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں۔“
”تو پھر کیا کوئی اور شخص اس کی موت کا ذمے دار ہے؟“
”نہیں۔“ میں نے پھر کہا۔ اگرچہ میرے ضمیر کی آواز گونج کر کہہ رہی تھی۔ ”میں! میں! میں اور تم، اور ہم دونوں! ہم دونوں اس کی موت کا موجب بنے ہیں! ہم دونوں اور اس کی بخت رعوت۔“ لیکن میں یہ الفاظ لبوں تک نہیں لایا، صرف یہ کہنے پر قناعت کی۔ ”نہیں۔ نہیں اس کی موت کے لیے کسی کو بھی مورد الزام نہیں ٹھیر لیا جاسکتا۔ اس کا مقدر یہی تھا۔“
”میں یہ تسلیم نہیں کر سکتا۔ یہ بات ناقابل یقین ہے۔“
”پر سوں رات یہ دعوت میں تھی اور وہاں مجھے دیکھ کر اس نے سلام کیا تھا اور مسکرائی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کس طرح یہ ایک ایک موت کی آغوش میں جاسوئی؟“

”میں نے اسے کچھ خود ساختہ حکایتیں سنائیں، مجھے اس کے محبوب سے بھی یہ راز مخفی رکھنا تھا۔ ہم نے وہ دن، اگلا دن اور اس سے اگلا دن آنکھیں پر اور نہ گفتگو میں گزارا اگرچہ ہم نے ایک دوسرے کے سامنے اس امر کے اظہار سے اجتناب کیا کہ ہم دونوں کی زندگیاں عورت سے وابستگی کی وجہ سے ایک رشتے میں مربوط ہیں۔

”بار بار یہ محسوس کرنے کے باوجود کہ میرے لیے یہ راز اپنے آپ تک محدود رکھنا مشکل ہے، میں نے بڑا جبر کر کے اُسے یہ علم نہیں ہونے دیا کہ عورت میرے پاس اپنی محبت کا ثمر تلف کرانے کے لیے آئی تھی اور میرے انکار پر اس نے وہ قدم اٹھایا جو اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ پھر بھی اس تمام عرصے میں، جب میں اس کے مکان میں چھاپا رہا، ہم نے عورت کے سوا کسی کے متعلق گفتگو نہیں کی۔ میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا ہوں کہ اس اثنا میں وہ لوگ مجھے ڈھونڈنے لگے تھے۔ عورت کا خاوند اس وقت پہنچا جب کفن کا منہ بند کر دیا گیا تھا۔ خاوند کو کچھ شبہ ضرور ہوا کیوں کہ کئی طرح کی انواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ مجھ

سے اصل واقعے کی تفصیل سننا چاہتا تھا لیکن مجھے اس شخص سے ملنا کسی طور مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ میں روپوش ہو گیا اور چار دن تک مکان سے باہر نہیں نکلا۔ عورت کے محبوب نے ایک فرضی نام کے تحت میرے لیے جہاز کے ٹکٹ کا انتظام کیا اور کافی رات گئے میں سنگاپور جانے والی کشتی پر سوار ہوا۔ میں نے اپنا سب کچھ وہیں چھوڑ دیا۔ اپنا تمام تر اثاثہ، حتیٰ کہ اپنی سات سالہ ملازمت کے دوران جو تحقیق کی تھی وہ بھی۔ اب میرا گھر ہر اس آدمی کے لیے جو اس میں داخل ہونا چاہے، کھلا ہوا ہے۔ ولندیزی حکومت نے میرا نام اپنے افسران کی فہرست سے ہٹا رکھا ہے۔ غیر حاضر ہونے کے سبب خارج کر دیا ہے۔ میرے لیے اس گھر، اس شہر اور اس دنیا میں رہنا ممکن تھا جہاں کی ہر شے مجھے عورت کی یاد دلاتی۔ اگر میں رات کی تاریکی میں چوروں کی طرح وہاں سے بھاگا ہوں تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ میں اس سے بچنا چاہتا تھا اور اسے فراموش کر دینے کے لیے کوشاں تھا۔

لیکن بچ نکلنے کی یہ کوشش بھی کارگر نہیں ہوئی۔ جب میں رات کو جہاز پر سوار ہونے کے لیے پہنچا تو میرا دوست مجھے الوداع کہنے جہاز تک آیا، اس وقت ایک بڑا مستطیل صندوق جس پر تانبے کی چادر چڑھی تھی، کرین کے ذریعے جہاز پر لا دیا گیا۔ یہ اس عورت کا تابوت تھا، اس کا تابوت میرا تعاقب کر رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے میں نے پہاڑ سے ساحل سمندر تک اس کا تعاقب کیا تھا۔ میں کوئی اشدہ نہیں کر سکتا تھا اور نہ میں کسی چیز پر توجہ مرکوز کر سکتا تھا کیوں کہ اس کا خاوند بھی وہاں تھا۔ وہ انگلستان جا رہا تھا۔ شاید اس کا خیال وہاں جا کر لاش کا پوسٹ مارٹم کرانے کا ہو۔ شاید وہ یہ معلوم کرنا چاہے کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ بہر صورت اس نے عورت کو واپس لے لیا ہے اور ہم سے چھین لیا ہے، اب وہ ہمارے بجائے اس کی ملکیت ہے۔ سنگاپور، جہاں سے میں اس جرمن کشتی پر سوار ہوا، وہاں سے وہ صندوق بھی منتقل کیا گیا اور اس وقت اس کا خاوند نہیں موجود ہے لیکن میں اب بھی اس کی نگرانی کر رہا ہوں اور آخر دم تک اس کی نگرانی کرتا رہوں گا۔ اس کے خاوند کو کبھی اس کی موت کے راز کا علم نہیں ہو گا۔ میں تادم مرگ اسے اس شخص سے محفوظ رکھنے کی کوشش کروں گا جس سے بچنے کے لیے وہ موت سے ہم کنار ہو گئی، اسے ہرگز کسی بات کی خبر نہ ہوگی۔ اس کا راز اب اس دنیا میں کسی اور کی نہیں، صرف میری ملکیت ہے۔

”اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں باقی مسافروں سے الگ کیوں رہتا ہوں۔ یہ جانتے ہوئے کہ جہاز کے وسط میں چائے کی پیٹیوں اور برائیل کے اخروٹوں کے کھوکھوں کے

درمیان اس کی لاش رکھی ہے، میں کیوں کر انہیں ہنستے اور خوش گپیاں کرتے دیکھ سکتا ہوں، کیسے ان کے عشوہ و انداز برداشت کر سکتا ہوں؟ میں اس کے قریب نہیں پہنچ سکتا کیوں کہ نیچے جہاں اس کی لاش رکھی ہے وہاں تک جانے کا راستہ بند ہے، اس کے باوجود میں دن رات اس کا قرب محسوس کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ میری حماقت ہے۔ سمندر کی تہ میں اُن گنت لاشیں پڑی ہیں اور زمین پر ہر قدم پر مردے دفن ہیں لیکن یہ سب کچھ جاننے کے باوجود اس کی لاش کی موجودگی میں، اس جہاز کے مسافروں کا گانا اور ناچنا برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے علم ہے کہ اس کی لاش مجھ سے کس بات کی متوقع ہے۔ ابھی میرے لیے بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اس کا راز ابھی محفوظ نہیں ہے اور جب تک یہ محفوظ نہیں ہو جاتا، عورت کے ساتھ میرا عہد پورا نہیں ہوگا۔“

جہاز کے وسط سے پانی چھڑکنے اور صفائی کرنے والے عمل کی چل پھل سنائی دینے لگی۔ صلاح تختہ جہاز دھور ہے تھے۔ اس نے آواز پر کان لگائے اور دفعۃً کھڑا ہو گیا اور بڑبڑایا۔ ”مجھے اب جانا چاہیے۔“

مستطیل شراب نوشی اور کثرت گریہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور اس کا چہرہ بڑا اندوہ ناک نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک لخت آداب و تہذیب سے بیگانہ ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنی کثرت گفتار پر متاسف اور اپنے دل کا راز مجھ پر ظاہر کر بیٹھنے پر تادم تھا۔ پھر بھی دوستانہ انداز میں، میں نے اس سے کہا۔ ”کیا شام کو آپ مجھے اپنے کمرے میں آنے کی اجازت دیں گے؟“

ظہر، سندی اور یاس کی حامل مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ ذرا توقف کے بعد اس نے کسی قدر پُر زور لہجے میں جواب دیا۔ ”امداد کرنا ایک انسانی فریضہ ہے۔ یہ آپ کا دل پسند اصول ہے۔ چند گھنٹے پیشتر جب آپ نے مجھے مضحل پلایا تو یہ اصول بتا کر آپ نے میری زبان کھول دی۔ آپ کی ہم دردی کا شکریہ۔ میں اکیلا رہنا زیادہ پسند کروں گا۔ آپ یہ خیال نہ کیجئے کہ اپنے دل کا راز آپ سے کہہ دینے کے بعد اور اپنے جذبات آپ پر عیاں کر دینے سے میں اپنے آپ کو پہلے کی نسبت ہلکا محسوس کر رہا ہوں۔ میری زندگی کا پیر ہن تار تار ہو چکا ہے اور اب کوئی شخص یہ دھجیاں نہیں سی سکتا۔ میں نے سات سال تک ولندیزی نوآبادیات میں رہ کر کچھ بھی نہیں کمایا۔ میری پینشن ضبط ہو گئی ہے اور میں مفلس و قلاش جرمنی لوٹ رہا ہوں۔ ایک کتے کی طرح جو کفن کے پیچھے چھپتا پھرتا ہے۔ کوئی شخص خمیازہ بھگتے بغیر پاگل نہیں ہوتا اور انجام کار وہ گولی کا نشانہ بنتا ہے، میرے

لیے بھی اب وہ انجام قریب ہے۔ دوبارہ ملنے کی پیش کش کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں مگر مجھے تنہائی کی کلفت سے بچانے کے لیے بہترین ساتھی موجود ہیں، عمدہ ہمسائی کی بوتلیں۔ یہ میری تفتی کا سامان ہے اور ہاں، میرا ایک دیرینہ رفیق بھی ہے جس کی رفاقت سے، افسوس ہے کہ اب تک میں فائدہ نہیں اٹھا سکا اور اس سے میری نراو میرا پستول ہے، یہ میری روح کے لیے اعتراف کی نسبت زیادہ بہتر ثابت ہوگا۔

”اگر آپ نراو مانیں تو میں یہ کہوں گا کہ آپ میرے پاس آنے کی زحمت نہ کریں۔ دیگر انسانی حقوق میں ایک گریہ و نالہ بھی ہے جو کوئی کسی سے نہیں چھین سکتا اور جو ہر انسان جب، جہاں، جس طرح چاہے استعمال کر سکتا ہے اور جس کے لیے اسے کسی بیرونی امداد کی ضرورت نہیں ہوگی۔“

اُس نے قہارت سے مجھے دیکھا۔ مجھے علم تھا کہ وہ اپنا راز عیاں کر بیٹھنے پر دل ہی دل میں نادم تھا، حد درجے نادم۔ الوداع کا ایک لفظ کہے بغیر وہ وہاں سے چلا گیا اور گرتا پڑتا اپنے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اگرچہ اس کے بعد کئی دفعہ نصف شب کے قریب میں ڈیک پر پہنچا مگر پھر کبھی اُسے وہاں نہیں پایا۔ وہ کچھ ایسا غائب ہوا کہ شاید میں اپنے آپ کو کسی فریب نظر کا شکار سمجھنے لگتا اگر جہاز میں ایک ولندیزی مسافر کے بازو پر ماتمی نشان نہ دیکھ لیتا جس کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ اس کی بیوی کا پچھلے دنوں استوائی بخار سے انتقال ہو گیا ہے۔ وہ سب مسافروں سے الگ رہتا اور کسی سے گفتگو تک نہ کرتا۔ وہ رنجیدہ دکھائی دیتا تھا۔ اسے دیکھ کر اس احساس سے مجھے قلعی ہوا کہ میں اُس کی تکلیف سے واقف ہوں۔ جب میں اس کے پاس سے گزرا تو اس خیال سے میں نے منہ دوسری طرف کر لیا کہ کہیں وہ میرے چہرے سے یہ نہ بھانپ لے کہ میں اس کی تقدیر کے متعلق خود اس سے زیادہ جانتا ہوں۔

نیپلز کی بندرگاہ پر ایک واقعہ ہوا جو اس اجنبی کی کہانی کی روشنی میں میرے لیے سمجھنا آسان تھا جیسا کہ میں نے پہلے بتلایا ہے، زیادہ تر مسافر اس وقت ساحل پر تھے۔ میں تماشا گاہ سے ہو کر دیارِ دما کے ایک خوب صورت ہوٹل میں کھانا کھانے چلا گیا۔ جب میں جہاز کی طرف واپس آ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ قلیوں میں کھل ملی پھٹی ہوئی ہے اور بہت سی کشتیاں آگے پیچھے بھاگ رہی ہیں۔ لوگ روشنی ڈال ڈال کر پانی میں جھانک رہے تھے، ڈیک پر بہت سے سپاہی کھڑے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ میں نے ڈیک پر کام کرنے والے کارندوں میں سے ایک سے دریافت کیا تو وہ ہل گیا۔ مجھے ایسے معلوم ہوا جیسے اسے ہوشیار رہنے کی

ہدایت کی گئی ہو۔ اگلے روز جب جہاز جینوا کی طرف چلنے لگا تو بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا لیکن جینوا پہنچ کر میں نے ایک اطالوی اخبار میں گزشتہ رات کے حادثے کی زودلو پڑھی جو بڑے نمایاں طور پر شائع کی گئی تھی۔

”رات کی تہ کی میں مسافروں کو بے آرام ہونے سے بچانے کے لیے ایک میت بردار صندوق جہاز سے کشتی میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ اس میں ایک عورت کی لاش تھی جس کا خاوند، جو اسے دفنانے کے لیے وطن لے جا رہا تھا، نیچے کشتی میں کھڑا تھا۔ جب صندوق جہاز سے کشتی میں اتارا جا رہا تھا اور جہاز سے کشتی کی جانب نصف راستہ طے کر چکا تھا، عین اُس وقت کوئی بھاری بھر کم چیز اُس پر جہاز سے اس طرح گری کہ صندوق زور سے کشتی پر گرا اور کشتی الٹ گئی، صندوق پڑ چونکہ سکے کی پتیاں چڑھی ہوئی تھیں اس لیے سمندر میں ڈوب گیا۔ خوش قسمتی سے کوئی جانی نقصان نہیں ہوا کیوں کہ صندوق کسی کے اوپر نہیں گرا تھا۔ بد نصیب شہر کو دوسرے لوگوں سمیت، جو کشتی میں تھے، بڑی جلد و جہد کر کے بچا لیا گیا۔“

یہ واقعہ کس طرح پیش آیا، ایک اخباری نمائندے کی اطلاع کے مطابق ایک پاگل نے جہاز کے اوپر سے چھلانگ لگا کر صندوق رسوں سے علیحدہ کر دیا تھا۔ چھلانگ لگانے والے کی کہانی شاید صندوق لٹکانے والوں کی کوتاہی چھپانے کے لیے وضع کی گئی تھی جنہوں نے رستا ایسا کم زور استعمال کیا تھا جو ذرا سے وزن سے ٹوٹ گیا۔ بہر حال متعلقہ افسران اس بارے میں بالکل خاموش تھے۔

اخبار کے ایک دوسرے حصے میں ایک مختصر سی خبر تھی جس میں بتلایا گیا تھا کہ ایک نامعلوم شخص کی لاش نیپلز کی بندرگاہ کے قریب ملی ہے جس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کے سر میں گولی لگنے کا نشان ہے۔ کسی نے بھی وہ لاش اس حادثے سے منسلک کرنے کی کوشش نہیں کی تھی جو صندوق جہاز سے اتارتے ہوئے پیش آیا تھا۔

میں یہ مختصر سطور پڑھ رہا ہوں اور اخبار کے صفحے سے اس افسردہ آدمی کی بھیانک صورت کا عکس میرے سامنے آ گیا ہے جس کی کہانی میں نے ان صفحات میں رقم کی ہے۔



Zegham imran